تصوف اسلام

عبدالماجد دریابادی

تصوّفِ اسلام

اسلامی تصوّف کا عطر، قدماء صوفیہ کی تعلیمات کا لب لباب
اور ان کی تصانیف پر تبصرہ

از

عبدالماجد دریابادی

قیمت

روپیہ

ناشر

نسیم بکڈپو۔ لاٹوش روڈ لکھنؤ

ٹیلیفون ۔ ۲۴۵۵۹

ناشر عزیز الرحمٰن | { بار چہارم جون سنہ ۶۵ء } | پرنٹر انوار احمد صفدر پریس لکھنؤ

فہرست مضامین

تصوف اسلام

دیباچہ طبع چہارم

سنہ ۱۳۸۴ھ
۱۹۶۵ء

اس حقیر سی کتاب کو اول بار نکلے ہوئے ۴۰ سال گزر چکے۔ اور اس لمبی مدت میں ان اوراق کا جامع کہاں سے کہاں پہونچا۔ ساری درمیانی منزلوں کا بیان نہ یہاں ممکن ہے اور نہ یہ مقصود۔ انداز فکر اور اسلوب بیان کے جو جو دور گزر رکے ہیں اُن کا پتہ بقدر ضرورت تینوں اڈیشنوں کے دیباچوں سے چل جائے گا۔ موجودہ اڈیشن کے وقت کتاب پر نظر ثانی تو اول سے آخر تک کر لی گئی اور لفظ و عبارت میں ترمیم و اصلاح بھی اچھی خاصی ہو گئی۔ معنوی ترمیم سے بھی کہیں کہیں کام لیا گیا ہے تاہم کوئی بنیادی بلکہ اہم ترمیم بھی مناسب نہیں خیال کی گئی۔ ـــــ گو ظاہر ہے کہ جو کتاب ۷۲ سال کی عمر میں لکھی جاتی وہ قدرتاً اس سے بہت مختلف ہوتی جو ۳۲ سال کے سن میں لکھی گئی۔

غلطیاں، خامیاں، لغزشیں، ہر سن و سال میں لازمۂ بشریت ہیں۔ فرق یہ ہے کہ جوانی کی نظر اپنی کوتاہیوں کی طرف کم جاتی ہے۔ زیادہ سن آجانے پر اپنی عقل و فکر کی نارسائی، اپنی تحقیق کی ناصوابی، اپنی نظر کی کوتاہی، یہ سب واضح و نمایاں ہو جاتی ہیں۔

بہر حال اب دعا صرف اس قدر ہے کہ اس مجموعہ اوراق کے جو حصے صحیح و مرضیٔ حق کے مطابق ہیں اللہ اُسے اُمت، ملت، انسانیت کے حق میں نافع و

بابرکت بنائے اور جو حصہ باطل و خلاف حق ہو اس سے عفو و درگزر فرمائے۔

دریاباد
ضلع بارہ بنکی
جنوری ۱۹۶۵ء، مطابق رمضان ۱۳۸۴ھ

عبدالماجد

طبع سوم

۱۳۶۵ھ

۱۹۴۶ء

عربی میں ایک مقولہ چلا آتا ہے کہ فقہ تو پڑھی ڈاڑھی نہیں، لیکن کتاب فقہ پر لکھ ڈالی ہے، اردو میں بھی چلی ہوئی مثل ہے کہ پڑھے نہ لکھے نام محمد فاضل —— یہ کہاوتیں کسی اور پر صادق آتی ہوں یا نہ ہوں، ان سطور کے راقم پر تو ضرور ہی صادق ہیں، تصوف، حقیقت تصوف، تاریخ تصوف، فلسفہ تصوف، فن کے ظاہری و باطنی کسی شعبہ سے کوئی علاقہ نہیں، لیکن کتاب فن پر تیار! —— اس لئے اجازت ہو تو قبل اس کے کہ ناظرین کچھ آگے پڑھیں انہیں عربی کے اس مشہور، عارفانہ و حکیمانہ کلام کی یاد ایک بار دلا دی جائے، کہ

انظر ما قال ولا تنظر الی من قال،

نظر صرف قول پر رکھئے قائل کو نظر انداز کیجئے، بس یہ دیکھئے کہ بات کہی کیسی گئی یہ نہ دیکھئے کہ کہنے والا بھی کس شمار و قطار میں ہے۔

کتاب ۲۳-۱۹۲۲ء کی لکھی ہوئی ۲۲-۲۳ سال بعد آج پریس میں تیسری بار جا رہی ہے، اور نظر ثالث کے دور سے نومبر و دسمبر ۱۹۴۵ء میں گذری ہے، جہاں تک نفاذ

عبارت کا تعلق ہے اس بار بھی مسودہ کو شروع سے آخر تک پڑھ کر جا بجا مناسب ترمیمیں کر دی گئی ہیں، کہیں کچھ حذف، کہیں کچھ اضافہ، کہیں کچھ اور رد و بدل

معنوی حیثیت سے چاہیئے تو یہ تھا کہ طبع اوّل اور طبع سوم کے درمیانی فاصلۂ بعید کا لحاظ کر کے بہت کچھ بڑھا دیا جاتا، لیکن ایسا نہ ہو پایا۔ تغیرات صرف اتنے ہوئے ہیں کہ

(۱) فقر محمدی جو طبع دوم میں ایک ضمیمہ کی حیثیت رکھتا تھا، اُسے اب کی ایک مستقل باب بنا دیا گیا ہے،

(۲) "مرشد کی تلاش" جو طبع دوم میں ضمیمۂ دوم تھا، ضمیمہ اب صرف اسی کو رکھا گیا ہے، ہاں اُس کے نفس مضمون پر نظر ثانی کر کے اُسے ضخیم و وسیع بہت بنا دیا گیا ہے — مرشد کی اہمیت اب نظر میں اُس درجہ میں باقی نہیں رہی، جو آج سے ۲۵ سال قبل تھی! اکبر الہ آبادی کا ایک شعر بھی اس سلسلہ میں یاد پڑ گیا، ؎

تجربہ خود ہی بتا دیتا ہے مرشد اکبر ۔۔۔ سچ کہا آپ نے پیری میں مریدی کیسی

البتہ ایک رسالہ اس درمیان میں ایسا نظر پڑا کہ اگر اسکا مختصر تعارف بھی ناظرین سے نہ کرایا جائے، تو یہ اُن کے ساتھ بڑا بخل ہوگا۔ رسالہ کا نام القصد الی اللہ ہے، زبان عربی، ایک قلمی نسخہ کوئی ۲۵ سال کی مدت ہوئی نواب سالار جنگ حیدر آبادی کے کتب خانہ میں نظر سے گذرا تھا، اور اُس کی نقل بھی اُسی زمانہ میں نواب ممدوح کی اجازت و عنایت سے حاصل ہو گئی تھی، دوسرا قلمی نسخہ مع تحت اللفظ فارسی ترجمہ کے مولانا عبد الباری مرحوم فرنگی محلی کے ہاں نظر آیا، اور مرحوم سے بھی اس کی نقل لی گئی۔ مصنف کی کنیت ابو القاسم ہے، اور کتاب میں جا بجا قال ابو القاسم العارف آتا ہے، مصنف کا نام دو نسخوں میں جنید بغدادی لکھا ہوا ملا، لیکن رسالہ جنید کی تصنیف یوں نہیں کہ کتاب کے درمیان میں ایک سنہ درج ہے، جو وفات جنید سے بہت بعد کا ہے، معلوم ایسا ہوتا ہے کہ محض کنیت کے اشتراک کہ آپ کی بھی

یہی کیفیت ہے) اور نفس موضوع کی مناسبت سے رسالہ کے کسی کاتب نے اسے حضرت جنیدؒ کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ پھر دوسرے نسخوں میں بھی وہی نقل ہوتا رہا۔ پرانے قلمی نسخوں میں اس قسم کی غلطیاں نادر نہیں،

بہر حال مصنف ابو القاسم جنید تو نہیں، البتہ کوئی دوسرے ابو القاسم عارف وہ جو بھی ہوں ہیں وہ کوئی بڑے ہی شخص، اور غالباً چوتھی صدی ہجری کے، ان کی کتاب کے سرسری خاکے سے بھی اندازہ ہو جائے گا، کہ تصوف وسلوک کے اس زمانہ میں کیا معنی تھے،

کتاب ایک مختصر تمہید کے بعد ذیل کے دس بابوں میں تقسیم ہے:-

(۱) فی القصد الی اللہ تعالیٰ وما یستقبل من العقبات یعنی جو اللہ کی طرف قدم اٹھاتا ہے، اُسے کن کن دشوار گذار مرحلوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے،

(۲) فی ترک الوقوف من المنازل والمقامات عند القصد الیہ یعنی سالک جب قدم اٹھاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُسے مقامات ومنازل پر رکنے نہیں دیتا بلکہ اپنے ہی لئے خاص کر لیتا ہے۔

(۳) فی نداء الحق سبحانہ وتعالیٰ الی سر القاصدین الیہ واستماعھم لہ یعنی اللہ تعالیٰ سالکین کے دل میں اپنی ایسی تمنا ڈال دیتا ہے، کہ اس کے آگے ان کے دل سے ساری تمنائیں رخصت ہو جاتی ہیں۔

(۴) فی اجابۃ القاصدین نداء الحق بعد استماعھم لہ یعنی سالکین طریق آواز حق سننے کے بعد اس کا اتباع بھی کرتے ہیں،

(۵) ما ینبغی للقاصدین من یعنی سالکین کو کن تیاریوں کی ضرورت ہوتی ہے، جن کے بعد ہی وہ یافت کے اہل ہو سکتے ہیں۔

(۶) ما ینبغی للقاصدین من رعایۃ النفس والروح والقلب یعنی سالک کو نفس روح اور قلب کی کس حد تک رعایت ضروری ہے،

(۷) فی مشاورۃ النفس والروح والقلب فی امور القصد الی اللہ تعالیٰ یعنی

طریق میں نفس وروح وقلب کے کیا کیا درجے اور مرتبے ہیں،

(۸) القاصدین الی اللہ وصفتہم وعلامتہم بین الاشیاء یعنی سالکین طریق کے صفات وخصوصیات کا ذکر،

(۹) فی القصد الی اللہ تعالیٰ وبیان قصۃ ابی یزید یعنی اصل سلوک بحکایت بایزید سے اس پر استشہاد،

(۱۰) فی حکایت القاصدین الی اللہ تعالی وقصصہم یعنی مشہور سالکین طریق کی حکایتیں،

اول کے نو بابوں میں معرفت وطریقت کے تمامتر اصول ومسائل ہیں، جنھیں بدعات مروجہ اور رسوم ومشارکت سے کوئی مناسبت ہی نہیں، بس مجاہدات کا ضبط خواہشات کا ترک لذات کا بیان ہے اور آخری باب میں حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام سے لے کر حضرت ابراہیم ادھم تک حضرات انبیاء واولیاء کی حکایتیں درج ہیں، ــــ عرسوں اور اونچے گنبد والے مزاروں کے رواجی تصوف کا ذکر کہیں آس پاس نہیں،

جن ناظرین کرام کی نظر سے یہ رسالہ گذرے، اُن سے بمنت درخواست ہے کہ حکیم الامت اشرف العلماء حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے صوفیانہ مضامین ورسائل کا مطالعہ ضرور فرمائیں انشاء اللہ طریق سے متعلق ہر مشکل آسان ہو کر رہے گی ایسا مجدد فن مدتوں سے نہیں پیدا ہوا تھا حضرت کی تحریریں اس موضوع پر کوئی ایک دو نہیں چھوٹی بڑی ملا کر اُن کی تعداد بچاسوں بلکہ شاید سیکڑوں سے بھی اوپر ہے۔

آج جو بڑے بڑے اکابر فن وائمہ طریق مشہور چلے آرہے ہیں، آیندہ تاریخ سلوک اسلامی میں انہی کی صف میں انشاء اللہ حضرت کا نام نامی بھی نظر آئے گا۔

حال کے اچھے لکھنے والوں میں ایک صاحب اور بھی ہیں، مغربی طرز کے تعلیمیافتہ ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب ایم اے، پی ایچ، ڈی، صدر شعبہ فلسفہ جامعہ عثمانیہ دکن، انکی

تحریریں بھی اس موضوع پر خصوصاً انگریزی تعلیم یافتوں کے حق میں آب حیات کا حکم رکھتی ہیں
عین ان سطور کی تحریر کے وقت ان کی تازہ کتاب قرآن و تصوف آئی ہوئی ہے۔

سب سے آخر میں عرض یہ ہے کہ پڑھنے والے اگر لطف و کرم سے اس کم سواد بے استعداد و عاصی و پر معاصی کو دعائے خیر سے یاد فرمائیں گے تو یہ ان کی ذرہ نوازی سے بعید نہ ہوگا، اور خود ان کے لئے ان شاء اللہ باعث اجر ہوگا۔

جنوری ۱۹۴۷ء

دریاباد - بارہ بنکی

عبدالماجد

دیباچہ طبع دوم

سنہ ۱۳۴۸ھ

۱۹۲۹ء

پورے پانچ سال ہونے کو آئے جب تصوف اسلام اول بار شائع ہوئی تھی، رب کریم کے الطاف بے کراں کا شکریہ کس زبان سے ادا کیا جائے جس نے اپنے اس ہیچمداں اور بے مایہ بندہ کی قلمی کوشش کو کامیاب بنایا اور تین ساڑھے تین برس کی مدت میں پہلے اڈیشن کو ختم کرادیا، سنہ ۱۹۲۸ء کی آخری سہ ماہی میں طبع اول کے مسودہ پر نظر ثانی، اضافہ و ترمیم کا موقع ملا، اور سنہ ۱۹۲۹ء کی آخری سہ ماہی میں اس کی اشاعت کی نوبت آرہی ہے، ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء واللہ ذوالفضل العظیم ہ

طبع اول کو بعض اہل دل بزرگوں کی پیشگاہ سے خلعت قبول حاصل ہوا اور ان کی دعاؤں کی برکتیں رائگاں نہیں جاسکتیں، دوسری طرف نامور مستشرق کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر نکلسن نے بھی بہت حوصلہ افزا خیالات کا اظہار فرمایا، اور اپنے گرامی نامہ میں اس ناچیز تالیف کو "طلبہ تصوف کے لئے ایک نہایت مفید مقدمہ" قرار دیا، وہ کریم کارساز جس ذرہ کو چاہے آفتاب بنادے اور جس بے مایہ کو چاہے سرمایہ سے مالا مال کردے، "داد حق را قابلیت شرط نیست" جس کسی نے کہا ہے بالکل صحیح کہا ہے،

موجودہ اڈیشن میں مسودہ کی نظر ثانی لفظاً کی گئی ہے، جابجا عبارتیں بدل

دی گئی ہیں کہیں کہیں کسی مشکل لفظ کے بجائے آسان لفظ رکھ دیا گیا ہے، اکثر مقالات پر جزوی اضافے کئے گئے ہیں، اور ایک فاضل دوست کے حسب مشورہ ایک پورا باب (باب ۶) سرے سے نیا شامل کر دیا گیا ہے، ان کے علاوہ آخر میں دو مضمون اپنے ہفتہ وار سچ سے نقل کر کے بطور ضمیمہ بڑھا دیئے گئے ہیں، ممکن ہے ان کے مطالعہ سے کسی طالب کو کچھ نفع پہنچ جائے مقصد ان دونوں مقالات کا بھی وہی ہے جو ان اوراق کا ہے، یعنی صحیح اسلامی تصوف کی توضیح و تشریح، ان سب تغیرات سے قدرۃً حجم میں خاصہ اضافہ ہو گیا ہے، ظاہری ضخامت کے اضافہ کے ساتھ خدا کرے کچھ معنوی خوبیاں بھی پیدا ہو گئی ہوں۔

پچھلے سال اللہ کے فضل و کرم سے صاحب مثنوی حضرت مولانائے رومیؒ کے ملفوظات طیبات کی بھی جو اب تک غیر مطبوع اور شاید نامعلوم تھے بہ اضافہ مقدمہ و تبصرہ حواشی، طبع و اشاعت کی توفیق نصیب ہو گئی جو حضرات فارسی کی استعداد اوسط درجہ کی رکھتے ہیں اور تصوف کی تشریح اس مشہور و معروف عارف کی زبان سے نثر میں سننا چاہتے ہیں وہ شاید فیہ مافیہ (کہ یہی اس ملفوظ کا نام ہے) کا مطالعہ اپنے لئے بے لطف و بے نفع نہ پائیں[1]۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین ؕ

دریاباد۔ بارہ بنکی
ربیع الثانی ۱۳۴۸ھ
۱۹۲۹ء

عبدالماجد

---

[1] اس کے کئی سال بعد فیہ مافیہ کا ایک بہت عمدہ اور ہر حیثیت سے بہتر ایڈیشن ڈاکٹر فروزانفر ڈائرکٹر تعلیمات ایران نے ایران سے شائع کیا۔

دیباچہ طبع اول

اسلام خدا کی طرف سے بندوں کے حق میں کامل ترین و جامع ترین پیام رحمت ہے، انسان کے ذہنی و عقلی، اخلاقی و معاشری، جسمانی و روحی، انفرادی و اجتماعی تمام ضرورتوں کا کفیل اور ہر شعبۂ حیات میں ترقیوں کا ضامن، خدا رسی و خدا شناسی کی تعلیم اس کا اصل مقصود تھی، اس پر اس نے خاص طور سے زور دیا، اور اس کے ذرائع و وسائل اس نے اس جامعیت کے ساتھ بیان کئے کہ ان میں کسی قسم کے تغیر و ترمیم تخفیف و اضافہ کی گنجائش نہ چھوڑی،

مسلمانوں میں ابتداء سے ایک گروہ ایسا موجود ہے جس نے تمام مقاصد دنیوی سے قطع نظر کر کے اپنا نصب العین محض یاد خدا و ذکر الٰہی کو رکھا، اور صدق و صفا، سلوک و احسان کے مختلف طریقوں پر عامل رہا،

شروع شروع یہ گروہ دوسرے ناموں سے ملقب رہا، ایک طویل عرصہ گذر جانے کے بعد رفتہ رفتہ اسکے مسلک کا نام مسلک "تصوف" پڑ گیا، اور یہ گروہ "گروہ صوفیہ" کہلانے لگا،

اصطلاح "تصوف" کب سے رائج ہوئی؟ اس بحث کا یہاں موقع نہیں، نہ اس لفظ کے اشتقاق اور اس کی تحقیق لغوی کو اس وقت بیان کرنا مقصود ہے، یہاں کہنا صرف یہ ہے کہ اس گروہ کے اکابر قدیم پہلے مسلمان تھے، پھر صوفی، وہ تصوف کو اسلام کے مقابل ایک جداگانہ مسلک کی حیثیت سے نہیں لاتے تھے، بلکہ اسلام کے تحت، اسی کی پاکیزہ

ترین صورت کو کہتے تھے، وہ اپنے اسلام کو، اپنے تصوف پر مقدم رکھتے تھے، اور تصوف کو محض اس لئے عزیز و محبوب رکھتے تھے کہ وہ اُن کی نظر میں اسلام کی خالص ترین و پاکیزہ ترین تعبیر تھی،

صفحات آئندہ میں بعض قدیم اکابر صوفیہ رحمۃ اللہ علیہم کی اصل تصانیف کی مدد سے یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ان حضرات کے نزدیک تصوف کا مفہوم محض اس قدر تھا کہ اتباع کتاب و سنت میں انتہائی سعی کیجائے، اسوہ رسول و صحابہ کو دلیل راہ رکھا جائے، اوامر و نواہی کی تعمیل کیجائے، طاعات و عبادات کو مقصود حیات سمجھا جائے، قلب کو محبت و تعلق ماسوا سے الگ کیا جائے، نفس کو خشیت الٰہی سے مغلوب کیا جائے اور صفائے معاملات و تزکیۂ باطن میں جہد و سعی کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ ہونے پائے،

حضرت شیخ جیلانی بلکہ ان کے مرید باختصاص اور بانی سلسلہ سہروردیہ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی تک کی تصانیف میں یہ اسلامی عنصر قائم، اور یہی رنگ غالب ہے، اس زمانہ کے بعد شیخ ابن عربی کے اثر سے نظام تصوف میں فلسفیانہ عنصر کو غلبہ ہونے لگا، وحدت وجود وغیرہ کے مسائل پیدا ہونے لگے، اور فارسی شاعری کے اثر سے ان تخیلات کو اور تقویت ہوتی گئی، چنانچہ ملا جامیؒ کی لوائح (جیسا کہ آگے چل کر اسی کے تبصرہ کے ذیل میں ظاہر ہوگا) ایک اچھی خاصی فلسفیانہ تصنیف کی حیثیت رکھتی ہے، تاہم نویں صدی کا یہ تصوف بھی اگرچہ ابتدائی صدیوں کے تصوف سے بہت کچھ منحرف ہوچکا تھا، ان رسم پرستیوں سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا، جس پر آج اکثر خانقاہوں اور درگاہوں میں تصوف کا اطلاق ہوتا ہے۔

تصوف کی موجودہ مسخ شدہ شکل یونانی اوہام، ایرانی تخیلات، ہندی مراسم اور دیگر غیر اسلامی عناصر کا ایک معجون مرکب ہے، جس کے صرف بعض اجزا اسلامی کہے جاسکتے

ہیں، اور وہ بھی بڑی تلاش و دیدہ ریزی کے بعد نظر آتے ہیں، حاشا ثم حاشا یہ اسلامی تصوف نہیں، اسلامی تصوف وہ تھا جو خود حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا، جو ابوبکر صدیقؓ و علی مرتضیٰؓ کا تھا، جو سلمانؓ و ابوذرؓ کا تھا، جس کی تعلیم جنید بغدادیؒ و رابعہ بصریؒ نے دی ہے، جس کی ہدایت شیخ جیلانیؒ و شیخ سہروردیؒ و خواجہ اجمیریؒ و محبوبؒ دہلوی و خواجہ نقشبندیؒ و مجدد سرہندیؒ کرتے رہے، اور جس کی دعوت اس دور آخر میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی زبان قلم دیتی رہی،

خواجہ معین الدین اجمیری سلسلۂ چشتیہ کے مسلم مقتدا ایک بزرگ گذرے ہیں ملفوظات مبارک کا مجموعہ دلیل العارفین کے نام سے خواجہ قطب الدین بختیارؒ کا فراہم کیا ہوا شائع ہو چکا ہے، رسالہ مذکور اول سے آخر تک نماز و عبادات کی تاکید اور اتباع سنت رسولؐ کے فضائل سے بھرا ہے، وضو وغیرہ کے بعض معمولی سنن کی پابندی پر اتنا زور دیا گیا ہے کہ آج اکثر دل کو فرائض میں اس کا نصف اہتمام بھی نصیب نہیں، اور اس باب میں اس سے بھی زیادہ قابل ذکر بانی سلسلۂ عالیہ قادریہ محبوب سبحانی حضرت شیخ جیلانی کی کتاب غنیۃ الطالبین ہے، جو شروع سے آخر تک بجائے کسی درویش و صوفی کے ٹھیٹھ فقیہ اور عالم متشرع کی فقہی تالیف نظر آتی ہے،

سلسلۂ عالیہ چشتیہ کے ایک اور گوہر درخشاں خواجہ نظام الدین محبوب الٰہیؒ دہلوی تھے جن کے ملفوظات میں سب سے زیادہ معتبر رسالہ فوائد الفواد مرتبہ امیر حسن علا سنجریؒ اور حالات و سوانح میں رسالہ سیر الاولیاء (مرتبہ میر خوردؒ دہلوی) موجود ہیں، ان رسائل کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:-

"بندہ را پیش طلبید و فرمود کہ باید کہ مشغول پیوستہ بہ طاعت و عبادت باشی۔"

ص ۲۴ (فوائد الفواد مطبوعہ نول کشور)

"حکایت جماعت متحیران افتاد ... ... یکے از حاضران حکایت کرد کہ

من وقتے جائے رسیدم و ایں چنیں ہفت کس را دیدم دو چشم در آسمان داشتہ، شب و روز متحیر ماندہ، مگر آنکہ وقت نماز در می آمد، ایشاں نماز می گذاردند و باز ہمچناں متحیر می ماندند، خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر فرمود کہ آرے انبیا معصوم اند و اولیاء محفوظ ہمچنیں باشد، کہ گفتی۔ اگرچہ شب و روز متحیر باشد، اما نماز ایشاں فوت نہ شود (ص۱۲۲ ایضاً)

"چوں عمر عزیز سلطان المشائخ بہ ہشتاد کشید، پنج وقت نماز بجہت جماعت از بالائے بام جماعتخانہ کہ عمارتے بس رفیع است فرود آمدے، و با درویشاں و عزیزاں کہ در آں جمع ملکوت حاضر می شدند نماز گذاردے (سیر الاولیاء ص۱۲۴)

اکابر چشتیہ کی زندگیاں، صحیح تصوف اسلامی کا نمونہ نہیں، تفصیل کسی مناسب موقع پر بیان ہوگی،

عہد نبوت سے تقریباً ایک ہزار سال گذرنے پر شیخ احمد سرہندی پیدا ہوئے انھوں نے نہ صرف سلسلہ نقشبندیہ بلکہ تمام سلاسل تصوف میں تجدید و اصلاح کا صور اس بلند آہنگی کے ساتھ پھونکا کہ اس کی صدائے بازگشت آج تک دنیائے اسلام کے در و دیوار سے آرہی ہے، شیخ موصوفؒ کے مکتوبات کے ضخیم دفتر ملک میں شائع ہو چکے ہیں، ان میں شروع سے آخر تک مختلف اسلوبوں اور پیرایوں میں صرف ایک ہی دعوی کی تکرار، صرف ایک دعوت کا اعادہ ہے، اور وہ یہی ہے کہ صوفیہ کو عقائد و اعمال ہر شے میں کتاب سنت ہی کو اپنا دلیل راہ بنانا چاہیئے، اور اس کے خلاف جس کسی کے بھی اقوال ہوں انہیں مردود سمجھنا چاہیئے، چند اقتباسات ملاحظہ ہوں،

"بدانکہ از جملہ ضروریات طریق سالک اعتقاد صحیح است کہ علمائے اہل سنت آں را از کتاب و سنت و آثار سلف استنباط فرمودہ اند...... و اگر بالفرض

خلاف آں معانی مفہومہ بکشف و الہام امرے ظاہر شود، آں را اعتبار نہ باید کرد از آں استعاذہ باید نمود (مکتوبات مجددی حصہ ۵ ص۴۷ مطبوعہ امرتسر)

شریعت را صورتے است و حقیقتے، صورتش آن ست کہ علماء ظواہر بر بیان آں متکفل اند و حقیقتش آں کہ صوفیہ علیہ باک ممتاز اند۔ (حصہ ۳ ص۵۷)

آنچہ بر ما فقیراں لازم است دوام ذل است و افتقار و انکسار و تضرع والتجاد و ادائے وظائف عبودیت و محافظت حدود شرعیہ و متابعت سنت سنیہ (حصہ ۳ ص۵۶)

" ولایت را درجات اند بعضہا فوق بعض، زیرا کہ بر قدم ہر نبی ولایت است مخصوص بآں و انتہائے درجات آں ہماں درجہ الیست کہ بر قدم پیغمبر ماست ...... و ازیں مقام عزیز الوجود نصیب کامل و حظ وافر حاصل است بہر کمل تابعانِ آں سرور ما علیہ الصلوٰۃ والسلام پس لازم گیرید متابعتِ آنحضرت را صلعم اگر شمایاں بتحصیل این دولت قصوی و تکمیل ایں درجہ علیا متوجہ اید (حصہ اوّل ص۴۰)

" محمد رسول اللہ محبوب رب العالمین است، ہر چیز کہ خوب و مرغوب است برائے مطلوب و محبوب است لہٰذا حق سبحانہ تعالیٰ در کلام مجید خود می فرماید، اِنَّكَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِيمٍ، و نیز می فرماید تعالیٰ و تقدس اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ و نیز فرمودہ تعالیٰ و تقدس، اَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ او را علیہ الصلوٰۃ والسلام صراط مستقیم خواندہ و ماسوائے او را داخل سبل گردانیدہ و اتباع آں منع فرمودہ ....

باطن متمم ظاہرات و مکمل آں، سر موے باہم مخالفت ندارد ...... پس سالکانِ سبل طریقت و حقیقت را اگر در اثنائے راہ اموریکہ بظاہر باشریعت

درجنگ اند ظاہر شوند وظاہر سازند مبنی بر سکر وقت وغلبہ حال است، اگر از آں مقام گذرانند وبہ صحو آرند، آں منافات بالکلیہ مرتفع می شود وآں علوم متضادہ بہ تمام ہباءً منثوری گردند۔" (ایضاً صد ۲ ص ۳۰۲)

مکتوبات مجددی کی ایک ایک سطر اسی تعلیم محمدی سے لبریز ہے۔ دور آخر میں یہی دعوت شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنی مختلف تصنیفات وصایا، القول الجمیل، حجۃ اللہ البالغہ، فوز الکبیر وغیرہ کے ذریعہ سے پیش کی، پھر ان کے صاحبزادے شاہ عبد العزیز نے اپنی ملفوظات، فتاوی واجزائے تفسیر کے اوراق میں اور آج کل یہی پیام زیادہ ترمرتب ومنظم صورت میں خانقاہ امدادیہ اشرفیہ (تھانہ بھون) کے در ودیوار سے مل رہا ہے۔

اس رسالہ کو افسوس ہے کہ بعض وجوہ سے بہت مختصر ہی رکھنا پڑا۔ خدائے پاک وبرتر اس حقیر خدمت کو قبول فرمائے اور دور حاضر کے مسلمانوں کو صحیح اسلامی تصوف کے سمجھنے اور اس کے اختیار کرنے کی توفیق نصیب کرے،

دریاباد۔ بارہ بنکی

۲۱ ربیع الثانی سنہ ۱۳۴۳ھ

عبد الماجد

۲۰

(۱) کتاب اللمع

(از شیخ ابو النصر سراج)

(الف) مصنف[۱]

پورا نام عبد اللہ بن علی بن محمد بن یحییٰ ابو النصر سراج تھا لقب طاؤس الفقراء وطن طوس تھا، مرقد بھی یہیں ہے، آباؤ اجداد زہد میں شہرت رکھتے تھے، کان ابو النصر من اولاد ان ھاد (تاریخ الصوفیہ للسلمی)

خود سراج علوم ظاہری و باطنی کے جامع تھے، کان المنظور الیہ فی ناحیتہ فی الفتوۃ ولسان القوم مع الاستظہار بعلم الشریعۃ وھو فقیہ مشائخہم الیوم (ایضاً)

"در فنون علم کامل بود" (تذکرۃ الاولیاء عطارؒ)

ماہ رجب ۳۷۸ھ (اکتوبر یا نومبر ۹۸۸ء) میں حالت نماز میں وفات پائی۔ ایک روایت مشہور کے مطابق وفات سے قبل فرمایا کہ جس میت کو میرے مزار کے سامنے سے لے کر نکلیں گے اس کی مغفرت ہو جائے گی۔ صدیوں بعد کے

---

[۱] ماخذ:۔ (۱) تذکرۃ اولیاء عطارؒ ۲ جلد (مطبوعہ لیڈن) (۲) نفحات الانس، جامیؒ (کلکتہ) (۳) سفینۃ الاولیاء شہزادہ دارا شکوہ (لکھنؤ) (۴) مقدمۃ کتاب اللمع پروفیسر نکلسن (لیڈن) کشف المحجوب، شیخ علی ہجویری (لاہور)

تذکرہ نویسوں کا بیان ہے کہ طوس میں ابتک یہ دستور چلا آتا ہے کہ ہر جنازہ کو پیشتر ان کے مزار پر لاتے ہیں،

استادوں میں جعفر الخلدی (المتوفی سنہ ٣٤٨ھ) ابوبکر محمد بن داؤد الدقی (متوفی سنہ ٣٦٠ھ) اور احمد بن محمد سایح کے نام لئے گئے ہیں، بعیت کی روایت ابو محمد مرتعش نیشاپوری سے کی گئی ہے، ان کا سال وفات سنہ ٣٢٨ھ ہے، ان کا ذکر تو کتاب میں کوئی پانچ بار آیا ہے، لیکن ان کے مرشد ہونے کا کہیں اشارہ نہیں ہے۔ ملاقات سری سقطی اور سہل تستری سے بھی بیان کی گئی ہے، گو اول الذکر کا سال وفات سنہ ٢٥٣ھ اور آخر الذکر کا سنہ ٢٨٣ھ ہے، واللہ اعلم،

تصوف پر متعدد کتابیں تصنیف کیں، ملا جامی کے الفاظ میں "وے را تصانیف بسیار است" (نفحات الانس) لیکن آج بجز کتاب اللمع کے اور کوئی بظاہر موجود نہیں، بلکہ ان کے نام تک بھی معلوم نہیں،

تصوف و معرفت میں جو پایہ رکھتے تھے، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ شیخ فرید الدین عطار جو خود شیخ الکل کا حکم رکھتے ہیں، ان کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"آں عالم عارف، آں حاکم خائف آں امین زمرۂ کبراد، آں نگین حلقۂ فقراد آں زبدۂ اشاج، شیخ ابو النصر سراج رحمۃ اللہ علیہ امامے بر حق بود دیگانۂ مطلق و متعین و متمکن و اورا طاؤس الفقراء گفتندے، و صفت وفنت او نہ چندان ست کہ در قلم و بیان آید و یا در عبارت و زبان گنجد و در فنون علم کامل بود و در ریاضت و معاملات شانے عظیم داشت، در حال و قال و شرح دادن بہ کلمات مشایخ آیتے بود۔"

ایسے ہی الفاظ جامی وغیرہ بھی لائے ہیں،

چند ارشادات و واقعات جو تذکروں میں محفوظ رہ گئے ہیں اُن سے کچھ اہل ذوق

ان کے مرتبۂ کمال کو کچھ نہ کچھ تو جان ہی سکتے ہیں،

فرماتے تھے عشق اس آگ کا نام ہے جو عاشقوں کے دل اور سینہ میں جلتی رہتی ہے، اور اللہ کے سوا جو کچھ ہے، اسے جلا کر خاکستر کر دیتی ہے،

یہ بھی ارشاد تھا کہ بہ لحاظ ادب انسانوں کے تین طبقے ہیں، ایک طبقہ اہل دنیا کا ہے کہ اس کے نزدیک ادب، فصاحت، بلاغت و حفظ علوم و فنون، و اسماء ملوک و اشعار عرب کا نام ہے، دوسرا طبقہ اہل دین کا ہے، اس کے نزدیک ادب سے مراد عبادت، جوارح و حفاظت حدود و ترک شہوات و ریاضت نفس ہے، تیسرا طبقہ اہل خصوص کا ہے، اس کے ہاں ادب سے مفہوم، طہارت قلب، مراعات سر، وفائے عہد، نگہداری وقت، نیکو کرداری، وقت حضور، مقام قرب ہے،

ایک تیسرا ارشاد ہے، اسے اصل فارسی ہی میں سنئے، الفاظ کی نزاکت شاید اردو ترجمہ کی متحمل نہ ہو سکے:۔

"نسبت بخدا است، و از خدا بر اسے خدا است، و آفاتے کہ در نماز افتد از نیت افتد، و اگرچہ بسیار بود، آں را مواز نتواں کرد با نسبتے کہ خدا را بود، و بخدا اے بود۔"

ایک بار ماہ رمضان میں بغداد میں وارد ہوئے اور مسجد شونیزیہ کے ایک حجرہ میں معتکف ہوئے، درویشوں نے متفق ہو کر نماز میں اپنا امام بنایا، ماہ مبارک کی تراویح میں پانچ بار قرآن مجید ختم کیا، اسی سے ظاہر ہے کہ حافظ قرآن، اور تراویح میں سنانے کے عادی تھے، روزانہ افطار کے وقت خادم ایک روٹی حجرہ میں پہنچا آتا تھا، عید کی نماز پڑھا کر بغداد سے روانہ ہو گئے، خادم نے حجرہ میں جا کر دیکھا تو پوری روٹیاں جوں کی توں رکھی ہوئی پائیں، خدا معلوم کیا کھا کر پورا رمضان گزارا،

ایک مرتبہ سردی کے موسم میں شب کے وقت آتش ان کے قریب تشریف فرما تھے،

چند اور اہلِ دل حضرات بھی تھے، گفتگو معرفتِ الٰہی پر ہو رہی تھی، دفعتہً شیخ پر زور کی کیفیت طاری ہوئی، اور جوش میں آکر دہکتی ہوئی آگ میں سجدہ میں گر پڑے، مریدین خوفزدہ ہو کر باہر بھاگے، دوسرے روز آئے تو دیکھا کہ چہرہ چاند کی طرح چمک رہا ہے، اور جلنے کا کہیں خفیف داغ تک نہیں، عرض کی، حضورِ والا، یہ کیا ماجرا ہے، ہم تو سمجھ رہے تھے کہ سارا چہرہ جل گیا ہوگا، ارشاد ہوا کہ "جس نے درگاہِ الٰہی پر اپنی آبرو دیدی، اس کے چہرہ کو آگ نہیں جلا سکتی"

(فارسی فقرہ کی جان لفظ "آبرو" ہے اردو ترجمہ میں اس کا لطف منتقل نہیں ہو سکتا)

تذکروں میں اور روائتیں کراماتی قسم کی اس سے بڑھ بڑھ کر لکھی ہوئی ہیں، یہاں صرف دو نقل کر دی گئیں،

شیخ نے معلوم ہوتا ہے سیاحی خوب کی تھی، اور ممالکِ اسلامیہ کے دور دراز علاقوں کے سفر کر ڈالے تھے، کم از کم اتنے مقامات کے نام تو اسی کتاب میں مل جاتے ہیں، بصرہ ربذہ، مکہ، بغداد، رملہ، دمشق، الطیرخ، قاہرہ، بیت المقدس، بسطام، تستر، تبریز، گویا حجاز، ایران، عراق، شام، مصر، طرابلس ایشیائے کوچک کے سفروں میں تو شبہ ہی نہیں

(ب) تصنیف

یہ علم تو نہیں کہ کتاب کس سنہ میں، اور مصنف کے کس سِن میں تصنیف ہوئی، لیکن مصنف کا سنہ وفات ۳۷۸ھ ہے، اس سے ظاہر ہے کہ کتاب چوتھی صدی ہجری کے وسط کی پیداوار ہے، اور اس لئے اس کا شمار بجا طور پر تصوف کی قدیم ترین کتابوں میں ہے۔

آج سے ۴۰ سال قبل دنیا کتاب اللمع کے صرف نام سے آشنا تھی، سنہ ۱۹۰۹ء میں کیمبرج یونیورسٹی (انگلستان) کے استاذ فارسی اور عاشق کتب تصوف ڈاکٹر نکلسن نے دو قلمی نسخے کھوج نکالے، ایک نسخہ سنہ ۶۸۳ھ کا لکھا ہوا اور دوسرا سنہ ۵۴۸ھ کا پانچ سال کی دیدہ ریزی کے بعد، دونوں نسخوں کا مقابلہ کرکے پروفیسر موصوف نے اصل کتاب کو غایت اہتمام کے ساتھ سنہ ۱۹۱۴ء میں شائع کر دیا، اور متعدد مفید اضافے بھی کئے مثلاً شروع میں مفصل فہرست مضامین، آخر میں مبسوط فہرست رجال و نساء اماکن و قبائل و کتب وغیرہا، اور بہ کثرت حواشی، اور انگریزی میں ملخص ترجمہ، وغیرہ،

ان معنوی خصوصیات کے ساتھ کاغذ، طباعت وغیرہ کے حسنِ ظاہری کے لوازم کو بھی ملحوظ رکھا، اور کتاب لیڈن کے بریل (BRILLE) پریس سے چھاپ کر کے شائع کر دی، کتاب کا پورا نام کتاب اللمع فی التصوف ہے، ملا جامی نے نام کا املا کتاب اللمعہ (باضافہ ہائے ہوز) درج کیا ہے لیکن اصل کتاب کے نسخوں میں یہی املا ہے،

کتاب کی ضخامت ۴۳۶ صفحے کی ہے، اور ایک مقدمہ اور ۱۳ حصوں میں تقسیم ہے،

مقدمہ (ص ۱ تا ۱۴) اس قسم کے مباحث پر شامل ہے:-

باب البیان عن علم التصوف،

باب فی نعت طبقات الحدیث،

باب الکشف عن اسم الصوفیہ،

باب اثبات علم الباطن،

باب التصوف ماہو،

باب التوحید وصفۃ الموحد

ان ضروری تمہیدی اور تعارفی مسائل کے بعد کتاب بالکل صحیح منطقی ترتیب کے ساتھ حسب ذیل حصوں میں تقسیم ہوتی ہے،

(۱) کتاب الاحوال والمقامات (ص ۱-۴۱)

"حال" و "مقام" صوفیہ کے ہاں کی اہم اصطلاحیں ہیں، چنانچہ اس حصہ میں مقامات احوال اور ان کے حقائق میں سے ہر شے پر الگ الگ ایک ایک باب میں بحث کی ہے، مثلاً باب مقام التوبہ، باب مقام الورع، باب مقام الزہد، باب مقام الصبر، باب مقام التوکل، باب حال الخوف، باب حال المحبۃ، باب حال الشوق، باب حال المشاہدہ و قس علیٰ ہذا،

(۲) کتاب اہل الصفوۃ فی الفہم والاتباع لکتاب اللہ، (ص ۴۲-۹۲)

مبادی کی تشریح کے بعد آغاز کلام قدرۃً کتاب اللہ سے ہوتا ہے، اور اس کے تحت میں اس قسم کے ابواب ہیں:۔

باب الموافقۃ بکتاب اللہ، باب ذکر تفاوت المستمعین خطاب اللہ تعالیٰ، باب وصف ارباب القلوب فی فہم القرآن، باب ذکر السابقین والمقربین والابرار من طریق الفہم والاستنباط وغیرہا،

(۳) کتاب الاسوۃ والاقتداء برسول صلی اللہ علیہ وسلم، (ص ۹۳-۱۰۴)

"کتاب" کے معاً بعد "سنت" کا ذکر قدرۃً آنا چاہیے، اور یہی ہوا، اس کے تحتانی

عنوانات اس قبیل کے ہیں،

باب وصف اہل الصفوۃ فی الفہم والموافقۃ والاتباع للنبی صلعم، باب ماروی عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی اخلاقہ، وافعالہ واحوالہ التی اختارہا اللہ تعالیٰ، باب ماذکر عن المشائخ فی اتباعہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، وتخصیصہم فی ذالک وغیرہا

(۴) کتاب المستنبطات (ص ۱۰۵ تا ص ۱۱۸)

قرآن وحدیث یا کتاب وسنت کے نصوص کے بعد ایک مومن کے لئے ترتیباً اب اُن احکام وشعائر کا ذکر آنا چاہیئے، جو انہی پر مبنی، متفرع یا اُنہی سے ماخوذ ومستنبط ہوں چنانچہ عین اسی فطری ترتیب کے مطابق چوتھے نمبر پر یہ حصہ ہے، اس کے ذیل میں اس قسم کے مباحث مندرج ہیں،

باب مذہب اہل الصفوۃ فی المستنبطات الصحیحۃ فی فہم القرآن والحدیث، باب فی کیفیۃ الاختلاف فی مستنبطات اہل الحقیقۃ فی معنی علومہم واحوالہم، باب فی استنبطاتہم فی معانی اخبار مرویۃ عن رسول اللہ صلعم طریق الاستنباط والفہم وغیرھا،

(۵) کتاب الصحابۃ رضوان اللہ علیہم (ص ۱۱۹-۱۲۰)

رسول کے بعد ایک مومن کے لئے مقدس ترین ہستیاں صحابہ کرامؓ کی ہیں، اور قدیم صوفیۂ کرام سنت نبوی کے بعد آثار صحابہ ہی کو اپنے لئے دلیل راہ جانتے تھے، اس لئے قدرۃً ایک مستقل حصہ اُن کی نذر ہے، اس کے ذیلی ابواب میں خلفائے اربعہؓ پر، اصحاب صفہ پر، عام اصحاب نبوی پر، سب پر الگ الگ گفتگو ہے، اور حضرت صدیقؓ کا تذکرہ تخصیص وتفصیل دونوں کے ساتھ ہے،

(۶) کتاب آداب المتصوفہ (ص ۱۲۱-۲۱۰)

اس کے تحتانی ابواب کے چند عنوانات یہ ہیں،

باب ذکر آدابہم فی الوضوء والطہارۃ، باب ذکر آدابہم فی الزکوٰۃ والصدقات، باب فی ذکر الصوم وآدابہم فیہ، باب ذکر آدابہم فی الحج، باب ذکر آدابہم عند مجاراۃ العلم، باب ذکر من آدابہم فی وقت الطعام، باب فی ذکر آدابہم فی وقت السماع والوجود، باب فی ذکر آدابہم فی اللباس، باب فی ذکر آدابہم عند الموت،

یہ حصہ کتاب کے طویل ترین حصوں میں سے ہے، اور اس میں صوفیہ کے آداب زندگی سے موت تک ہر ہر شغل اور وقت کے درج ہیں،

(۷) کتاب المسائل واختلاف اقاویلہم فی الاجوبۃ (ص ۲۱۱-۲۳۱)

اس حصہ میں صوفیہ کرام کی زبان سے ان سوالات کے جوابات دئے ہیں جن کا حل کرنا فقہاء اور علماء ظاہر کے لئے دشوار ہے، مثلاً جمع و تفرقہ، فنا و بقا، مسئلہ صدق، مسئلہ اخلاص، مسئلہ روح،

اس حصہ کو مختلف ابواب میں تقسیم نہیں کیا ہے، بیان مسلسل ہے،

(۸) کتاب المکاتبات والصدور والاشعار والدعوات والرسائل (ص ۲۳۲-۲۶۶)

اس حصہ میں (جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے) حضرات صوفیہ کے مکتوبات، رسائل، اشعار، دعوات، وصایا کا ذکر کیا ہے، اور ہر ایک کو ایک ایک علحدہ باب میں لکھا ہے،

(۹) کتاب السماع (ص ۲۶۷-۲۹۹)

صوفیہ اور علمائے ظاہر کے درمیان اور خود صوفیہ میں باہم ایک اہم اختلافی موضوع مسئلہ سماع ہے، یہ حصہ اسی مسئلہ کی توضیح و تشریح کے لئے وقف ہے، اس کے ماتحت چند عنوانات یہ ہیں:-

باب فی حسن الصوت والسماع وتفاوت المستمعین، باب فی وصف سماع العامۃ واباحتہ ذالک، باب فی وصف سماع الخاصۃ وتفاضلہم فی ذالک، باب فی ذکر طبقات المستمعین، باب فی وصف سماع المریدین والمبتدئین، باب فی وصف

نفوس الخصوص واھل الکمال فی السماع،

(۱۰) کتاب الوجد (ص ۳۰۰-۳۱۴)

وجد وحال بھی تصوف کا ایک جز شروع سے سمجھا گیا ہے، اس حصہ کے مباحث کا اندازہ ابواب تحتانی کے ان عنوانات سے ہوگا:-

باب فی ذکر اختلافھم فی ماھیۃ الوجد، باب فی صفات الواجدین باب فی ذکر تواجد المشائخ الصادقین، باب فی الواجد الساکن والواجد المتحرک

(۱۱) کتاب اثبات الآیات والکرامات (ص ۳۱۵-۳۳۲)

کراماتِ اولیاء کا صحیح مفہوم، ان کے اثبات کے دلائل، معجزاتِ انبیاء سے اُن کا فرق، یہ سب مباحث بھی ضروری تھے، اور وہ اس حصہ میں آگئے۔ عنواناتِ ابواب کا نمونہ یہ ہے:-

باب فی معانی الآیات والکرامات، باب فی الادلۃ علی اثبات الکرامات للاولیاء، باب فی ذکر مقامات اھل الخصوص فی الکرامات،

(۱۲) کتاب البیان عن المشکلات (ص ۳۳۳-۳۷۴)

اس حصہ میں کل دو باب ہیں، پہلے باب میں اُن الفاظ کو جمع کر دیا ہے، جو صوفیہ کی زبان میں مخصوص اصطلاحی معنی رکھتے ہیں، مثلاً حال، مقام، مکان، وقت، مشاہدہ، سر، کشف، فنا، بقا، توحید، تجرید وغیرہا، اور دوسرے باب میں ان اصطلاحات کی تشریح کی ہے،

(۱۳) کتاب تفسیر الشطحیات والکلمات التی ظاہرہا مستشنع وباطنہا صحیح مستقیم، (ص ۳۷۵-۴۴۴)

یہ کتاب کا آخری حصہ ہے، جو حصہ ہفتم کی طرح پوری طرح تفصیل سے لکھا گیا ہے، اس میں شطحیاتِ صوفیہ کی توجیہ و توضیح ہے، نیز ان غلط فہمیوں کی اصلاح جن میں اکثر علمائے ظاہر و صوفیۂ ناقص مبتلا رہتے ہیں، چند ابواب کے عنوانات یہ ہیں:-

باب فی معنی الشطح، باب تفسیر العلوم و بیان ما یشکل علی فہم العلماء من علوم الخاصة و تصحیح ذالك بالحجة، باب فی کلمات شطحیات تحکی عن ابی یزید، باب فی ذکر ابی الحسن النوری، باب فی ذکر من غلط فی الاحوال، باب فی ذکر من غلط فی فناء البشریة، باب فی ذکر من غلط فی الانوار، باب فی ذکر من غلط فی الروح، وغیرہ۔

عنوانات ہی پر ایک سرسری نظر کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ تصوف سے متعلق جتنے ضروری پہلو نکل سکتے ہیں مصنف نے ان میں سے کسی کو بھی نظر انداز نہیں ہونے دیا ہے، ہر ضروری شعبہ کو لیا ہے، اور اس پر تفصیل اور تحقیق سے گفتگو کی ہے، زبان و انداز بیان میں بھی خاص سلاست و سادگی ہے، یہاں تک کہ جو (راقم السطور کی طرح) عربی زبان میں مبتدی ہیں وہ بھی مطالب کتاب سے مستفید ہو سکتے ہیں۔

اب ذیل میں کتاب کے مختلف مقامات سے اقتباسات دیے جاتے ہیں جن سے مرتبہ تصنیف اور نوعیت مسائل دونوں کا پورا اندازہ ہو سکے گا،

پہلا سوال ایک غیر صوفی کے دل میں یہ پیدا ہوتا ہے، کہ تصوف آخر ہے کیا شے؟ اور اسلام نے آیا تصوف اور صوفیہ کا کوئی مرتبہ تسلیم کیا ہے؟ حضرت مصنف اس کے جواب میں قرآن مجید کی آیت شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ (آل عمران، آیت ۹۸) پیش فرما کر لکھتے ہیں:-

ذکر اللہ تعالیٰ افضل المومنین	اللہ تعالیٰ نے تمام مؤمنین سے بلند
عنده درجة واعلاهم فی الدین	برتر مرتبہ ان کا رکھا ہے جو اولی العلم او
رتبة فذکرهم بعد ملائکته وشهد علی	قائمین بالقسط ہیں، اور ملائکہ کے بعد
شهادتهم له بالوحدانیة بعد	انہی کی شہادت پیش کی ہے چنانچہ فرمایا
ما بدء بنفسه وثنّی بملائکته	شہد اللہ الخ اور سرور کائنات صلی اللہ
فقال عز وجل شهد الله انه	علیہ وسلم نے بھی علماء کو جانشین انبیاءؑ

لا اله الا هو والملئكة واولوا العلم
قائماً بالقسط وروى عن النبي صلعم
انه قال العلماء ورثة الانبياء وعندي
والله اعلم ان اولى العلم القائمين
بالقسط الذين هم ورثة الانبياء
هم المعتصمون بكتاب الله تعالىٰ
المجتهدون في متابعة رسول الله
صلعم المقتدون بالصحابة والتابعين
السالكون سبيل اولياء الله المتقين و
عباده الصالحين هم ثلثة اصناف
اصحاب الحديث والفقهاء والصوفية
فهؤلاء الثلثة الاصناف من اولى العلم
القائمين بالقسط الذين هم
ورثة الانبياء (ص۵)

ارشاد فرمایا ہے سو یہ القاب
میرے خیال میں ان لوگوں کے
حق میں وارد ہوئے ہیں، جو کتاب
اللہ کا سر رشتہ مضبوط تھامنے والے
اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی
متابعت کے پورے کوشاں اور صحابہ
اور تابعین کے نقش قدم پر چلنے والے
اور اللہ کے اولیاء متقین وصالحین
کی راہ اختیار کرنے والے ہیں، اور
ایسے اشخاص کو طبقات سہ گانہ میں
رکھا جا سکتا ہے، ایک طبقہ ارباب
حدیث کا ہے، دوسرا فقہا کا، اور
تیسرا صوفیہ کا بس یہی طبقات سہ گانہ اولو العلم
اور قائم بالقسط کہے جانے کے مستحق ہیں جو
انبیاء کے جانشین ہوتے ہیں،

بہت سے امور تو صوفیہ اور محدثین و فقہاء کے درمیان مشترک ہی ہوتے ہیں، جو عقائد ان کے ہوتے ہیں وہی ان کے بھی کتاب اللہ اور سنت نبوی کی پیروی یہ اور وہ دونوں اپنے لئے واجب سمجھتے ہیں، علوم و فنون سے جس طرح وہ کام لیتے ہیں یہ بھی کام لیتے ہیں، وقس علی ہذا،

ثم انهم من بعد ذالك ارتقوا
الى درجات عالية وتعلقوا باحوال

لیکن اس اشتراک کے بعد صوفیہ
انواع عبادات، حقائق طاعات

شریفة ومنازل رفیعة من انواع
العبادات وحقائق الطاعات
والاخلاق الجمیلة ولھم فی معانی
ذالک تخصیص لیس لغیرھم من العلماء
والفقھا واصحاب الحدیث

اور اخلاق جمیلہ سے جن درجات
عالیہ اور منازل رفیعہ کو طے کرنے
لگتے ہیں، وہاں تک علماء ظاہری اور
فقہا اور اصحاب حدیث کی رسائی بھی
نہیں ہو سکتی، (صفحہ ١١)

صوفیہ کے امتیازی خصوصیات جن میں دوسرے طبقات ان کے ساتھ شریک نہیں، اُن میں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کی توحید بالکل خالص ہوتی ہے غیر اللہ سے وہ کسی صورت بھی دل نہیں لگاتے اُن کی لو صرف اللہ سے لگی رہتی ہے۔

اوّل شئ من الخصیصات
للصوفیة .... ترک مالا
یعنیھم وقطع کل علاقة تحول
بینھم وبین مطلوبھم مقصود
ھم اذلیس لھم مطلوب ولا
مقصود غیر اللہ تعالیٰ (ص١١)

صوفیہ کی اولین خصوصیت یہ ہے کہ
وہ اللہ ہی پر نظر رکھتے ہیں، ان کا
مطلوب ومقصود تمامتر اللہ ہی ہوتا
ہے، ماسوا اور لایعنی مشغلوں سے
انھیں کوئی واسطہ نہیں،

اس کا لازمی اثر ان کی عملی زندگی پر یہ پڑتا ہے کہ :-

فمن ذالک القناعة بقلیل الدنیا
عن کثیرھا والاکتفاء بالقوت الذی
لابد منہ والاختصار علی مالا
بد منہ من مھنة الدنیا من الملبوس
والمفروش والماکول وغیر ذالک
واختیار الفقر علی الغنا والاختیار

قناعت کو اپنا شیوہ بنالیتے ہیں،
قلیل کو کثیر پر ترجیح دیتے ہیں، غذا،
لباس اور ہر قسم کے سامان دنیوی
سے صرف مایحتاج کو اختیار کرتے
ہیں، بجائے تونگری کے تنگدستی،
بجائے سیری کے گرسنگی، بجائے

ومعانقة القلة ومجانبة الکثرة وایثار الجوع علی الشبع والتقلیل علی الکثیر وترک العلو والرفع وبذل الجاه والشفقة علی الخلق والتواضع للصغیر والکبیر (ص۱۱)

افراط کے قلت، بجائے جاہ و ترفع کے تواضع و انکسار، ہر چھوٹے بڑے کے مقابلہ میں اپنے لئے وہ پسند کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ اور کیا ہوتا ہے؟ اور یہ ہوتا ہے کہ۔

حسن الظن باللہ والاخلاص فی المسابقة الی الطاعات والمسارعة الی جمیع الخیرات والتوجه الی اللہ تعالیٰ و الانقطاع الیه والعکوف علی بلائه والرضا عن قضائه والصبر علی دوام المجاهدة ومخالفة الهوی ومجانبة حظوظ النفس والمخالفة لها اذ وصفها اللہ تعالیٰ امّارة بالسوء والنظر الیها بانها اعدیٰ عدوک التی بین جنبیک کما روی عن رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم (ص۱۱۔۱۲)

اللہ سے حسن ظن رکھتے ہیں۔ تمام علائق و اسباب سے قطع نظر کر کے صرف اس پر تکیہ رکھتے ہیں، نیکیوں اور طاعتوں کی جانب خلوص نیت کے ساتھ پیش قدمی و تیز روی کرتے رہتے ہیں۔ بلاءِ الٰہی پر صابر اور قضاءِ الٰہی پر راضی رہتے ہیں، مجاہدہ اور مخالفت خواہش نفس میں مشغول رہتے ہیں، اور اس کو یاد رکھتے ہیں کہ کلام پاک میں نفس کو امارہ بالسوء سے تعبیر کیا گیا ہے، اور حدیث نبوی میں ارشاد ہوا ہے کہ انسان کا سب سے بڑا دشمن وہ ہے جو اس کے دونوں پہلوؤں (یعنی جسم) کے درمیان ہے

غرض اُن کے تمام اوصاف و اخلاق سنت نبوی و آثار صحابہؓ کی مطابقت میں ہوتے ہیں، اور گویا سب سے بڑا صوفی وہ ہے، جو سب سے زیادہ اہل القرآن اور متبع

سنت ہے، —— ہمارے زمانہ کے مشائخ، پیرزادوں، گدی نشینوں، صاحبانِ سجادہ کے رئیسانہ و شاہانہ طرزِ معاشرت کو اس صحیح درویشی اور فقیری سے کوئی نسبت ہی نہ

منکرین تصوف کا ایک گروہ کہتا ہے کہ قرآن اور احادیث نبوی کے سارے دفتر میں نہ کہیں "تصوف" کا نام آیا ہے نہ کہیں گروہ صوفیہ کا، اس لئے اس مسلک کو اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا، لیکن حضرت مصنف جو تصوف کے قائل ہیں، اس کے تذکرہ سے تو کلام مجید بھرا پڑا ہے۔ فرماتے ہیں کہ قرآن مجید میں ایسے الفاظ و عبارات بکثرت آئے ہیں، جن سے مراد اہل تصوف ہی ہیں، مثلاً صادقین و صادقات، قانتین و قانتات، خاشعین، موقنین، مخلصین محسنین، خائفین وجلین، عابدین، ذاکرین، صابرین، راسخین، متوکلین، مخبتین، اولیاء مصطفین، ابرار مقربین، سابقین مقتصدین، مسارعین الی الخیرات، مشاهدین (مثلاً اس آیت میں (والقی السمع وھو شھید) اور مطمئنین (مثلاً اس آیت میں الا بذکر اللہ تطمئن القلوب)

اسی طرح دفتر احادیث میں بھی اس طبقہ کی جانب اشارے صراحت کی حد تک مل جاتے ہیں، مثلاً:۔

انّ من اُمتی مکلّمون ومحدثون وان عمر منھم	میری اُمت میں ایسے لوگ بھی ہونگے جو مکالمہ (الٰہی) اور گفتگوئے (الٰہی) سے سرفراز کئے جائیں گے۔ اور عمر بھی انہی میں سے ہیں،
یدخل بشفاعتہ رجل من امتی الجنۃ مثل ربیعۃ و مضر یقال لہ اویس قرنی	میری امت میں ایک شخص ایسا بھی ہوگا، جس کی شفاعت سے لوگ جنت میں قبیلۂ ربیعہ و مضر کی طرح (یعنی بہت کثرت سے) داخل کئے جائینگے اور اس کا نام اویس قرنی ہوگا۔

معترضین کا ایک گروہ کہتا ہے، کہ عہد رسالت میں کوئی شخص صوفی کے لقب سے نہیں یاد کیا جاتا تھا، یہ اصطلاح بہت بعد کو ایجاد ہوئی ہے، اس لئے اسے کوئی مذہبی وقعت نہیں دی جا سکتی،

مصنف نے اس کا معقول اور دلچسپ جواب دیا ہے کہ

فنقول وبالله التوفيق الصحبة مع رسول الله صلعم لها حرمة وتخصيص من شمله ذالك فلا يجوز ان تعلق عليه اسم على انه اشرف من الصحبة وذالك بشرف رسول الله صلعم وحرمته الا ترى انهم ائمة الزهاد والعباد والمتوكلين والفقراء والراضين الصابرين والمخبتين وغير ذالك وما نالوا جميع ما نالوا الا ببركة الصحبة مع رسول الله صلعم فلما نسبوا الى الصحبة التي هي اجل الاحوال ان يفضلوا بالفضيلة غير الصحبة التي هي اجل الاحوال (ص۲۲)

اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کوئی دوسرا تعظیمی لفظ مستعمل ہو ہی نہیں سکتا تھا اس لئے کہ ان کے جتنے بھی فضائل تھے سب سے اشرف و اعظم ان کی فضیلت صحابیت تھی کہ صحبت رسول تمام بزرگیوں اور فضیلتوں سے بڑھ کر ہے، ان کا زہد، فقر، توکل، عبادات، صبر و رضا غرض جو کچھ بھی ان کے فضائل تھے، ان سب پر ان کا شرف صحابیت غالب تھا، پس جب کسی کو لفظ صحابی سے ملقب کر دیا گیا تو اس کے فضائل کی انتہا ہو گئی اور کوئی محل ہی باقی نہیں رہا کہ اسے صوفی یا کسی دوسرے تعظیمی لفظ سے یاد کیا جائے۔

رہا یہ اعتراض کہ یہ اصطلاح بغدادیوں کی رائج کی ہوئی متاخرین کی اختراع ہے، تو مصنف محقق کی تحقیق میں یہ قول بالکل غلط ہے، اس لئے کہ

لان فی وقت الحسن البصری	یہ لفظ حسن بصریؒ کے زمانہ میں رائج
رحمۃ اللہ علیہ کان یعرف	تھا، اور ان کا زمانہ بعض صحابیوں سے
ھذا الاسم وکان الحسن	معاصرت کا تھا، چنانچہ ان کے
قد ادرک جماعۃ من اصحاب	اور سفیان ثوری کے اقوال میں یہ
رسول اللہ صلعم	لفظ صوفی استعمال ہوا ہے۔

بلکہ کتاب اخبار مکہ میں جو روایت محمد بن اسحٰق بن یسار وغیرہ سے ہے اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ عہد اسلام سے پیشتر ہی معروف تھا، اور عابد و برگزیدہ اشخاص کے لئے مستعمل تھا، (صـ۲۲)

آج جو مشائخ طریقت قیود شریعت سے آزاد رہنا اپنے لئے باعث فخر سمجھتے ہیں، انھیں یہ سن کر مایوسی ہوگی اور شاید حیرت بھی، کہ قدما صوفیہ کے نزدیک طریقت و شریعت میں تخالف مطلق نہ تھا، بلکہ شریعت ہی کی تکمیل و اتمام کا نام طریقت تھا، حضرت مولف فرماتے ہیں، کہ علم کی دو قسمیں ہیں، ظاہری و باطنی، جب تک اس کا تعلق زبان و اعضا سے ہے اسے علم ظاہری سے تعبیر کریں گے، اور اس کا نام علم شریعت ہے، مثلاً عبادات میں طہارت، نماز روزہ، زکوٰۃ، حج وغیرہ یا احکام میں طلاق، فرائض، قصاص وغیرہ جب اس کا اثر ظاہر سے گذر کر قلب و باطن تک محیط ہو جاتا ہے، تو اسی کو علم باطن یا طریقت سے موسوم کر دیتے ہیں، اور یہاں عبادات و احکام کے بجائے مقامات و احوال کی اصطلاحیں رائج ہیں، مثلاً تصدیق، اخلاص، صبر، تقوی، توکل، محبت، شوق وغیرہ، اور اس تفریق دوگانہ کی سند قرآن مجید سے ملتی ہے ارشاد ہوا ہے کہ :۔

وَاَسْبَغَ عَلَیْکُمْ نِعَمَہٗ ظَاہِرَۃً	اس نے اپنی نعمتیں تمھارے اوپر پوری
وَّبَاطِنَۃً (لقمان، آیت ۲۰)	کیں، ظاہری بھی اور باطنی بھی،

دنیا میں ہر موجود کا ایک پہلو ظاہری ہے، اور ایک باطنی، چنانچہ قرآن کا بھی

ایک ظاہر ہے، ایک باطن، حدیث کا بھی ایک ظاہر ہے، ایک باطن، کتاب اللہ و سنت رسول کے اسی باطنی پہلو کا نام طریقت ہے، طریقت کتاب اللہ اور سنت رسول سے الگ کوئی شے نہیں، بلکہ انہی کے مغز و باطن کا نام ہے، (کشف ص ۲۵)

لفظ تصوف اور صوفی کی وجہ تسمیہ کیا ہے؟ اس کے جواب میں مولف علام نے مختلف قول نقل کر دئے ہیں، ایک قول یہ ہے کہ صوفی دراصل صفوی تھا، یہ لفظ ذرا ثقیل تھا، کثرت استعمال سے زبانوں پر صوفی رہ گیا۔

ابوالحسن قنادؒ کا خیال تھا کہ صوفی صفا سے مشتق ہے، اور اس کا اطلاق اہل صفا پر ہوتا ہے ایک اور بزرگ کا مقولہ ہے کہ جو لوگ کدورت بشریت سے پاک و صاف کردیے گئے وہ صوفی کہلانے لگے ایک اور بزرگ کی رائے میں ان لوگوں کا لباس انبیاء علیہم السلام کی تقلید میں صوف (پشمینہ) کا ہوتا تھا، اس لئے یہ صوفی کہلائے ایک اور گروہ اس طرف گیا ہے کہ اصحاب صفہ کے باقیات صالحات صوفی کے لقب سے موسوم ہوئے، وقس علی ھذا

حضرت جنیدؒ فرماتے تھے کہ ہمارا یہ سارا علم احادیث نبوی کا نچوڑ ہے، قرآن میں اتباع سنت نبوی کا حکم صاف الفاظ میں آیا ہے، وان تطیعوہ تھتدوا (نور رکوع ۷) ابوعثمانؒ سعید الحیری کا مقولہ تھا کہ جو شخص سنت نبوی کو قولاً و فعلاً اپنے اوپر حاکم بنالے، اس کی بات ہمیشہ حکمت سے لبریز نکلے گی، حضرت بایزید بسطامیؒ نے اللہ سے دعا کرنی چاہی کہ گرسنگی اور شہوت کی آفت سے ہمیشہ محفوظ رہیں، کہ معاً انھیں یہ خیال آگیا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لئے ایسی دعا نہیں کی تو میں کیونکر کر سکتا ہوں، یہ خیال کر کے وہ اس دعا سے باز رہے، اس احترام رتبہ رسالت کا صلہ انھیں یہ ملا کہ عورت کی خواہش ہی ان کے دل سے جاتی رہی، ذوالنون مصریؒ کا قول تھا کہ اللہ کو تو میں نے اللہ کے ذریعہ سے پہچانا، باقی اور سب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کے ذریعہ سے، سہل بن عبداللہ تستریؒ فرماتے تھے کہ جس وجد کی شہادت کتاب اللہ و سنت رسول نہ دیں وہ باطل ہے اور اسی کے قریب قریب قول ابو عثمان واراتی کا ہے، حضرت شبلیؒ مرض الموت میں مبتلا تھے، نزع کا وقت تھا، گویائی کی قوت جواب دے چکی تھی، ایک خادم وضو کرا رہا تھا، داڑھی میں خلال کرانا بھول گیا، شبلیؒ نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر داڑھی میں خلال کرائی کہ سنت رسول کا کوئی خفیف جزو بھی فروگذاشت نہ ہونے پائے ——— صوفیہ متقدمین کے یہ سارے اقوال و اعمال ایک مستقل باب میں جمع ہیں (صفحہ ۱۰۳-۱۰۴)

مسائل تصوف، مسائل فقہ کی طرح تمامتر کتاب اللہ و سنت رسولؐ ہی سے مستنبط و ماخوذ ہوتے ہیں، اس استنباط کا طریقہ اور اس کی کیفیت جو مصنف علام نے بیان کی ہے، وہ اس قابل ہے کہ اُسے بجنسہٖ نقل کر دیا جائے، ترجمہ لفظاً نہیں صرف خلاصتہً درج کیا جائے گا:-

المستنبطات ما استنبط اہل الفہم من المحققین بالموافقۃ لکتاب اللہ عزوجل ظاہراً و باطناً والمتابعۃ لرسول اللہ صلعم ظاہراً و باطناً والعمل بما بظواہرهم و بواطنهم فلما اعملوا بما علموا من ذالك ورثهم اللہ تعالیٰ علم ما لم یعلموا وهو علم الاشارۃ و علم مواریث الاعمال

استنباط کا حق ان محققین و ارباب فہم کو ہوتا ہے جو ظاہر و باطن ہر طرح کتاب اللہ و سنت رسول کے متبع ہوتے ہیں، یہ لوگ جب عرصہ تک اپنے علم و معلومات کے مطابق عمل کرتے رہتے ہیں، تو اللہ انھیں وہ علم بھی دیدیتا ہے جو پیشتر انھیں نہ تھا، اور یہ علم انہی کے ساتھ مخصوص رہتا ہے، وہ ان کے نفوس میں تزکیہ اور قلوب

التی یکشف اللہ تعالیٰ قلوب
اصفیائہ من المعانی المذخورۃ
واللطائف والاسرار المخزونۃ
وغرائب العلوم وطرائف الحکم
فی معانی القرآن ومعانی اخبار
رسول اللہ صلعم من حیث احوالہم
واوقاتہم وصفاء اذکارہم
قال اللہ تعالیٰ "افلا یتدبرون
القرآن ام علیٰ قلوب اقفالہا"
وقال النبی صلعم من عمل بما علم و
ورثہ اللہ تعالیٰ علم ما لم یعلم
وھو العلم الذی لیس لغیرھم
ذالک من اھل العلم واقفال
القلوب ما یقع علی القلوب
من الصدأ لکثرۃ الذنوب و
اتباع الھویٰ ومحبۃ الدنیا
وطول الغفلۃ وشدۃ الحرص
وحب الراحۃ وحب الثناء
والمحمدۃ وغیر ذالک من الغفلات
والزلات والمخالفۃ والخیانات
واذا کشف اللہ تعالیٰ ذالک

میں جلا پیدا کرتا ہے، اور کثرت
معاصی و شہوات، حب جاہ، حرص
طمع، خود پسندی وغیرہ سے جو زنگ
الواح قلب پر جما ہوتا ہے، وہ
دھل جاتا ہے اس وقت ان پر
اسرار غیب منکشف ہو جاتے
ہیں، اور ان کی زبانیں حقائق
عالیہ کی ترجمانی کرنے لگتی ہیں،

عن القلوب بصدق التوبۃ
والندم علی الحوبۃ فقد فتح
الاقفال من القلوب واتتہ
الزواید والفوائد من الغیوب
فیعبر عن زوائدہ وفوائدہ
بترجمانہ وھو اللسان الذی
ینطق بغرائب الحکم وغرائب العلم
فاذا شرحوا ھذہ التقط المریدون
والقاصدون والطالبون من
تلک الجواہر باذان واعیۃ و
قلوب حاضرۃ فما شوا وانتفعوا
بذالک وانعشوا (صفحہ ۱۰۶-۱۰۵)

اس کے بعد مصنف علام قرآن مجید کی اس آیت واذا جاء ھم امر من الامن او الخوف اذاعوا بہ ولو ردوہ الی الرسول والی اولی الامر منھم لعلمہ الذین یستنبطونہ منھم سے یہ لطیف استدلال کرتے ہیں کہ اولی الامر یا اہل علم وہ ہیں جو حقائق دین کے جاننے والے ہیں، اور ان کے طبقہ میں بھی جنھیں امتیازی خصوصیت حاصل ہے وہ اہل استنباط ہیں۔

اسوۂ رسولؐ کے بعد حضرات صوفیہ کے نزدیک سب سے زیادہ مہتم بالشان اسوۂ صحابہ ہے، اللمع کی کتاب الصحابہ ان کے اسی اعتقاد کی تفسیر ہے، صحابہؓ کی عام مدح وتکریم کے بعد اس باب کی پہلی فصل کا آغاز حضرت صدیقؓ کی ذات سے ہوتا ہے، جو اعظم الخوف واعظم الرجا تھے، یعنی اللہ سے ڈرتے بھی بیحد تھے، اور

اس کی رحمت کے اُمیدوار بھی بیحد رہتے تھے، چنانچہ فرماتے تھے کہ :-

لو نادی منادٍ من السماء انہ	اگر آسمان سے یہ ندا آئے کہ جنت میں
لن یلج الجنۃ الا رجل واحد	بجز ایک شخص کے اور کوئی داخل نہ
لرجوت ان اکون انا ہو ولو	ہوگا تو مجھے تو یہ امید پڑ جائے گی،
نادی منادٍ من السماء انہ	کہ وہ میں ہی ہوں گا اور اگر آسمان
لا یدخل النار الا رجل	سے یہ ندا آئے کہ بجز ایک کے کوئی
واحد لخفت ان اکون	دوزخ میں نہ ڈالا جائے گا تو میں
انا ہو (ص ۱۲۱)	اپنے ہی لئے ڈروں گا،

ابو العباس بن عطاء سے جب آیہ کریمہ کُونُوا رَبَّانِیِّینَ کے معنی دریافت کئے گئے تو انھوں نے کہا کہ ابو بکرؓ کے مانند ہو جاؤ، حضرت صدیقؓ ہی وہ شخص تھے جنھوں نے سارا مال و اسباب لا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مبارک میں حاضر کر دیا اور جب آپؐ نے دریافت فرمایا کہ اہل و عیال کے لئے کیا چھوڑا؟ تو برجستہ جواب دیا کہ اللہ اور رسول کو، سراج کہتے ہیں کہ یہ فقرہ توحید کے رنگ میں ڈوبا ہوا تھا، اور سب سے پہلا صوفیانہ ارشاد تھا، جو انسانی زبان سے ادا ہوا،

حضرت صدیقؓ کی سب سے بڑی خصوصیات، الہام و فراست تھیں اسی طرح حضرت عمر فاروقؓ کی نمایاں خصوصیات ترک شہوات، اجتناب شبہات اور تمسک بالحق تھیں، حضرت عثمانؓ کی اہم خصوصیات تمکین، ثبات و استقامت تھیں، حضرت علیؓ اکثر سلاسل تصوف کے شیخ الشیوخ ہیں، آپ علم لدنی کے سب سے بڑے حصہ دار تھے، یہ وہی علم لدنی ہے جو حضرت خضر کو عطا ہوا تھا، وعلمناہ من لدنا علما اور اسی بنا پر آپنے حضرت موسیٰؑ جیسے جلیل القدر پیغمبر سے کہدیا تھا کہ آپ صبر کے ساتھ میری رفاقت نہ کر سکیں گے، اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا اور یہیں سے بعض لوگوں

نے غلطی سے ولایت کو نبوت سے افضل قرار دے لیا ہے، حضرت علیؓ مراتب توحید، معرفت، ایمان، علم میں کامل ترین تھے —— اور ان چاروں اصحاب رسولؐ کے آثار قدیم صوفیہ کے لئے دلیل راہ ہیں،

خلفائے اربعہ کے بعد ذکر قدرۃً اصحاب صفہ کا آتا ہے، ان کی زندگی کا ایک ایک جزء طالبان طریقت کے لئے درس ہدایت ہے، یہ مقدس گروہ، معاشش دنیوی کی راہوں سے بیگانہ، بس شمع نبوت کے گرد پروانہ وار نثار رہتا تھا، ان کے ہاں نہ کھانے کا سامان رہتا تھا نہ اوڑھنے پہننے کا، اور ان کی زندگی فقر و فاقہ کے ساتھ تمام تر توکل و صبر اور عشق و محبت کا ایک تسلسل تھی، اس جماعت کی مدح خود متعدد آیات قرآنی میں آئی ہے، مثلاً

للفقراء الذین احصروا فی سبیل اللہ (بقر۔ آیت ۲۷۳)

ولا تطرد الذین یدعون ربھم (انعام۔ آیت ۵۲)

اس حصہ کی آخری فصل میں عام صحابہؓ کی زندگی پر نقشوفانہ حیثیت سے نظر کی گئی ہے اور ان کے اقوال و آثار کو صوفیہ کے لئے شمع ہدایت کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے اصحاب ذیل کے اسمائے مبارک اس حیثیت سے خاص طور پر قابل توجہ ہیں:—

طلحہ بن عبید اللہؓ، معاذؓ بن جبل، عمرانؓ بن حصین، سلمانؓ فارسی، ابو الدرداءؓ، ابو ذرؓ غفاری، ابو عبیدہؓ بن الجراح، عبد اللہؓ بن مسعود، براءؓ بن مالک، عبد اللہؓ بن عباس، کعبؓ احبار، حارثہؓ، ابو ہریرہؓ، انسؓ بن مالک، عبد اللہؓ بن عمر، حذیفہؓ بن الیمان، عبد اللہؓ بن جحش، اسامہؓ، بلالؓ، مصعبؓ بن عمیر، عبد الرحمٰنؓ بن عوف، حاکم بن حزامؓ، عبد اللہؓ بن رواحہ، عدیؓ بن حاتم رضی اللہ عنہم اجمعین،

حضرت سراج اکابر صوفیہ کے آداب و معمولات بیان کرنے کے بعد زدہ

ضرورت مرشد پر دیتے ہیں، اور اس ضمن میں گہرے گہرے خیالات کا اظہار فرماتے ہیں۔

بتدیوں کے ایک گروہ کا خیال یہ ہوتا ہے کہ حصول مقصد کے لئے بہترین ذریعہ مخالفت نفس کا ہے، چنانچہ اپنی تجویز سے طرح طرح کے مجاہدے اپنے لئے اختیار کر لیتے ہیں، کبھی غذا بہت گھٹا دیتے ہیں، لذیذ غذائیں بالکل ترک کر دیتے ہیں، وقس علیٰ ہذا حضرت سراجؒ فرماتے ہیں کہ جب تک مرشد یا شیخ اس قسم کے احکام نہ دے، انھیں اپنی رائے سے اختیار کر لینا قطعاً غیر مفید رہے گا بلکہ اندیشہ مضرت کا ہے، مثلاً ترک غذا کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انسان فرائض یومیہ، نماز پنجگانہ وغیرہ پوری طرح نہ ادا کر سکے گا، نفس امارہ کو زیر کر لینا اتنا آسان نہیں کہ بغیر استاد کامل کی توجہ کے، انسان تن تنہا یہ ہفتخوال طے کرے جائے، خود رائی اس راہ میں خطرہ و ہلاکت کی طرف لیجانے والی ہے، (صفحہ ۱۴۷-۱۴۸) سارے اعمال و مجاہدات کے لئے مخصوص آداب و شرائط ہیں، بغیر اُن کے قدم اٹھانا سخت نادانی ہے،

متوسطین و متاخرین صوفیہ کے گروہ میں سماع کی بحث ایک بڑی اہمیت رکھتی ہے، طریقت کے اس استاد قدیم نے بھی اس پر تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے، اس سلسلہ میں انھوں نے سب سے پہلے حسن صوت کو لیا ہے، اور اس کی مدح و توصیف میں متعدد احادیث نبوی نقل کی ہیں، مثلاً زینوا القرآن باصواتکم، یا ما بعث اللہ نبیاً الا حسن الصوت یا لقد اعطی ابوموسیٰ مزماراً من مزامیر آل داؤد و لما اعطی من حسن الصوت،

اس کے بعد سماع کے مختلف معانی، سماع شعر وغیرہ کا ذکر کیا ہے، اور متقدمین میں جو حضرات جواز سماع کے قائل گزرے ہیں، ان کے اقوال نقل کیے ہیں، آگے چل کر ایک باب اباحت سماع عامہ کے عنوان سے قائم کیا ہے، اس میں عید کے دن بیت عائشہؓ میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے گانا سننے کا حوالہ دیا ہے، حضرت ابوبکرؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت بلالؓ اور دوسرے صحابیوں کے اشعار پڑھنے کا ذکر

کیا ہے، اور مالک بن انسؓ، عبد اللہ بن عمرؓ، عبد اللہ بن جعفرؓ اور امام شافعیؒ سے شعر کو ترنم کے ساتھ پڑھنے کا جو جواز منقول ہے، ان سب کی سند جواز سے فائدہ اٹھایا ہے، لیکن یہ بالکل ظاہر ہے کہ ان ساری بحثوں کو پیشہ ور قوالوں اور گویوں کے گانے کی محفلوں سے جن میں لوگ بھی ہر قسم کے شریک رہتے ہیں، اور مضمون بھی ہر قسم کے گائے جاتے ہیں، اصلا کوئی تعلق نہیں،

سماع خاصہ کے ضمن میں سامعین کے تین طبقے کئے ہیں، مبتدیٔ مریدین، متوسطین و صدیقین، عارفین و اہل استقامۃ اور زمان، مکان و اخوان کی قید یاد دلائی گئی غرض یہ کہ مختلف ابواب میں مسئلہ سماع کے مختلف پہلوؤں کو لیا ہے، اور ہر باب میں ہر پہلو پر تفصیلی نظر کی ہے، اور جواز کے جو آداب اور جو شرائط و قیود ہیں ان سے کسی حال میں اغماض نہیں برتا ہے، آخر باب میں اس گروہ کے خیالات کی ترجمانی کی ہے، جو جواز سماع کا منکر یا اس کی کراہت کا قائل ہے ان چند ابواب کا مطالعہ مشایخ وقت کے لئے خاص طور پر سبق آموز ہوگا۔

اقتباسات و تلخیصات سے نوعیت کتاب کا کافی اندازہ ہو گیا ہوگا اور آج کی اعجوبہ پرستیوں سے اس کا مقابلہ کرنے سے صاف نظر آگیا ہوگا کہ یہ جو مجموعہ بدعات و منہیات، تصوف کے نام سے درگاہوں اور مزارات پر چل رہا ہے اس میں اور قدیم ترین اسلامی سلوک و طریقت میں فرق عظیم الشان ہے۔

(۲) کشف المحجوب

شیخ علی بن عثمان ہجویری

(الف) مصنف[1]

پورا اسم گرامی علی بن عثمان بن علی الغزنوی الجلابی اللاہوری ہے۔ شہرت علم عرف داتا گنج بخش سے ہے۔

وطن غزنی (افغانستان) تھا، ہجویر و جلاب دو قریے مضافات غزنی میں، قیام دونوں میں رہا آخر عمر میں ہندوستان آکر لاہور میں سکونت اختیار فرمائی تھی، یہیں انتقال کیا، یہیں دفن ہوئے اس ساری نقل و حرکت کے اظہار کے لئے نام کے ساتھ "غزنوی جلابی ہجویری لاہوری" کا ضمیمہ لگا ہوا ہے،

سید حسنی تھے، شجرۂ نسب تذکروں میں یوں دیا ہے، علی بن سید عثمان بن سید علی بن شاہ شجاع بن ابو الحسن علی بن حسن اصغر بن سید زید شہید بن سیدنا حضرت حسنؓ بن سیدنا حضرت علی مرتضیٰ رضؓ۔

---

[1] ماخذ (۱) نفحات الانس (جامی) (۲) سفینۃ الاولیاء (داراشکوہ) (۳) خزینۃ الاصفیا ۲ جلد (غلام سرور لاہوری، نولکشور پریس لکھنؤ) (۴) مآثر الکرام (غلام علی آزاد بلگرامی مطبوعہ حیدرآباد) (۵) فوائد الفواد (از امیر حسن علا سنجری، نولکشور پریس لکھنؤ)

بیعت شیخ ابو الفضل بن حسن ختلی سے کی تھی اور وہ شیخ ابو الحسن خصری کے مرید تھے، شجرۂ طریقت سید الطائفہ جنید بغدادیؒ تک پہونچتا ہے۔ جن دوسرے بزرگوں سے استفادہ کیا تھا، جابجا ان کا ذکر اپنے قلم سے کرتے گئے ہیں، اور ضمناً ان کے تعلقات پر روشنی بھی ڈالتے گئے ہیں، مثلاً شیخ ابو العباس احمد اشقانی کے ذکر میں ہے:-

مرا با وے انسے عظیم بود و وے را	مجھے ان سے بڑی محبت تھی اور وہ
بر من شفقت صادق اندر بعضے علم	بھی میرے اوپر دل سے شفقت رکھتے تھے
استاد من بود (کشف المحجوب صفحہ ۱۲۱)	اور بعض علوم میں میرے استاد تھے۔

ایک جگہ خواجہ ابو احمد مظفرؒ سے اپنی ملاقات کا حال لکھا ہے، اور ایک صوفیانہ مسئلہ کا بھی انکشاف کرتے گئے ہیں:-

روزے من اندر گرمائے گرم بنزدیک	میں ایکدن ان کے پاس سخت گرمی
وے اندر آمدم با جامہ راہ ژولیدہ	کے موسم میں آیا مسافرانہ کپڑے پہنے
موئے، مرا گفت یا ابا الحسن ارادت	ہوئے اور الجھے ہوئے بالوں کیساتھ مجھ سے
حالی مرا بگوی تا چیست، گفتم مرا سماع	پوچھا اسوقت کیا چاہتے ہو؟ میں نے کہا
می باید، اندر حال کس فرستاد و قوالے	سماع سنوائیے۔ انھوں نے فوراً کسی کو بھیجکر
بیارد و جماعتے را از اہل عشرت	ایک قوال اور چند گویوں کو بلا لیا، کم
و آتش کودکی و قوت ارادت و حرکت	عمری کے جوش و شوق میں میں سماع سے
ابتداء مرا اندر سماع کلمات مضطرب	بہت ہی متاثر ہوا، کچھ دیر بعد جب
کرد چوں زمانے برآمد و سلطان و غلیان	میرا جوش و خروش ختم ہو تو انہوں نے
آں اندر من کمتر شدہ مرا گفت	کہا کہ سماع کا مزا کیسا رہا، میں نے
چگونہ بود مرا ترا ایں سماع، گفتم	جواب دیا کہ اے شیخ میرے لئے تو بہت
ایہا الشیخ سخت خوش بودم گفت وقتے	ہی اچھا تھا، فرمایا ایک وقت ایسا آئیگا کہ

بباید کہ ایں زبانگ کلاغ ہر دو تراً یکساں شود، قوت سماع تا آنگاہ بود کہ مشاہدہ نہ باشد چوں مشاہدہ حاصل آید، ولایت سمع ناچیز شود، مگر تا ایں را عادت نہ کنی تا طبیعت نہ شود، (صفحہ ۱۲۳)

یہ سماع اور کوے کی آواز تمھارے لئے یکساں ہوجائے گی، سماع میں جان اسوقت تک ہے جبتک مشاہدہ پیدا نہیں ہوتا، جب مشاہدہ حاصل ہوجائیگا، تو سماع جاتا رہے گا، لحاظ رکھو کہ کہیں یہ عادت پڑ کر جزو طبیعت نہ بن جائے۔

اسی طرح بعض دوسرے مشاہیر معاصرین سلطان ابوسعید ابوالخیرؒ شیخ ابوالقاسم قشیریؒ، شیخ ابوالقاسم گرگانیؒ وغیرہم سے ملاقاتوں کے دلچسپ تذکرے لکھے ہیں، اپنے شیخ کے تذکرہ میں لکھتے ہیں :-

زین اوتاد شیخ عباد ابوالفضل محمد ابن الحسن الختلیؒ، اقتداے من اندر طریقت بدوست، عالم بود بہ علم تفسیر و روایات، و اندر تصوف مذہب جنید داشت و مرید حصری بود و صاحب یزدانی و اقران ابوعمر قزوینی و ابوالحسن بن سالبہ و شصت سال بحکم عزلتے صادق بگوشہا اندر میگریخت و نام خود از میان خلق گم کردہ بود و بیشتر بجبل لکام بودے، عمرے نکو یافت و ورا آیات و براہین بسیار بود

ابوالفضل محمد حسن ختلیؒ بزرگوں اور عابدوں کے سرتاج تھے، میں طریقت میں انہی کا مرید ہوں، علم تفسیر روایات کے عالم تھے، اور تصوف میں جنیدؒ کے ہم مذہب، حصریؒ کے مرید تھے، اور یزدانی کے دوست اور ابوعمر قزوینی اور ابوالحسن بن سالبہ کے معاصر تھے، ساٹھ سال تک اپنے کو شہرت خلق سے دور گوشہ نشینی اور گمنامی میں رکھا، قیام زیادہ تر کوہ لکام پر رہا، عمر اچھی پائی (ولایت کے) بہت سے ثبوت و شواہد رکھتے تھے، لیکن لباس اور آثار ظاہری

امالباس زرسوم متصوفہ نداشتی
وبا اہل رسم شدید بودے و من
از وے ہرگز مہیب تر مردے
نہ دیدہ بودم (صفحہ ۱۲۰)

صوفیہ کے رسوم سے دور رکھے - جو لوگ رسوم
صوفیہ کے پابند تھے، ان سے درشتی
برتتے، میں نے ان سے زیادہ پر رعب
کسی کو نہیں دیکھا ۔

حنفی المذہب تھے، امام ابوحنیفہ سے خاص عقیدت تھی، ان کا نام امام اماما و مقتدائے سنیاں شرف فقہاء و عز علماء" کی حیثیت سے لیا ہے، اور ان کے کمالات کا بیان تفصیل سے کیا ہے، (صفحہ ۶۶ تا صفحہ ۶۹) اس ضمن میں اپنا ایک دلچسپ خواب بھی تحریر کیا ہے، فرماتے ہیں:-

"میں ملک شام میں تھا، کہ ایک مرتبہ حضرت بلالؓ موذن رسولؐ کے مزار کے سرہانے سو گیا، خواب میں دیکھتا ہوں کہ مکہ معظمہ میں حاضر ہوں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باب بنی شیبہ سے اندر داخل ہو رہے، اور جس طرح کوئی کسی بچہ کو گود میں لئے ہو، آپ ایک مسن شخص کو گود میں لئے ہوئے ہیں، میں دوڑتا ہوا حضور میں پہونچا، پائے اقدس کو بوسہ دیا، اور دل میں سوچنے لگا، کہ یہ مسن شخص کون ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو میرے خطرۂ قلب پر اطلاع ہو گئی، ارشاد ہوا کہ یہ شخص تیرا اور تیری قوم کا امام ہے، یعنی ابوحنیفہؒ اس خواب سے مجھے اپنے اور اپنی قوم کے حق میں بڑی امیدیں قائم ہو گئیں، اور مجھے اس خواب سے یہ بھی منکشف ہو گیا کہ امام ابو حنیفہؒ ان لوگوں میں سے ہیں، جو اپنے صفات ذاتی سے فانی ہو چکے ہیں، اور محض احکام شرع کے لئے باقی رہ گئے ہیں، اس لئے کہ ان کے حامل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے، اگر میں انھیں چلتے دیکھتا تو معلوم ہوتا کہ وہ باقی الصفات ہیں، اور باقی الصفات کے لئے خطا و صواب دونوں کا امکان ہے لیکن چونکہ انھیں حضرت رسولخدا صلی اللہ علیہ وسلم کی گود میں دیکھا، اس سے معلوم ہوا کہ ان کا وجود ذاتی فنا ہو چکا

ہے، اور اب جو ان کا وجود قائم ہے، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود سے قائم ہے، اور چونکہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کسی طرح کی خطا کا امکان نہیں، اس لئے جس کا وجود ان میں فانی ہو چکا ہے وہ بھی امکان خطا سے پاک ہے"۔ (صفحہ ۶۸-۶۹)

سفر و سیاحت میں اکثر رہا کرتے تھے، شام سے لے کر ترکستان تک اور ساحل سندھ سے لے کر بحر خزرین تک یعنی اپنے زمانہ کی تقریباً ساری اسلامی عملداری کی سیاحی کا ذکر کیا ہے۔ آذربیجان، بسطام، دمشق، رملہ، بیت الجن، طوس، تہامہ اور جبل السلام کے نام اپنے سفر ناموں کے ذیل میں تصریح کیساتھ لئے ہیں، ایک مرتبہ عراق کے دوران قیام میں معلوم ہوتا ہے کہ معاش وافر تھی، اور اسی کے ساتھ مصارف کی زیادتی سے نوبت قرضداری کی آگئی تھی، اور یہ اس فکر میں گھلے جاتے تھے کہ ہر شخص کی حاجت روائی کیونکر کریں، آخر ایک درویش کی موعظت سے، پریشان خاطری سے رہائی نصیب ہوئی فرماتے ہیں:-

وقتے من اندر دیار عراق اندر
طلب دنیا و فنا کردن آن تا پاکی
می کردم و وام بسیار بر آمدہ بود
و حشویہ ہر کسے روا کہ بائستے بودے
روے من آوردہ بودند و من در
رنج حصول ہوائے شاں ماندہ
بودم، سیدے از سادات
وقت من نوشت کہ اے پسر نگہ تا
دل خود را از خدا مشغول نہ کنی

ایک بار میں حدود عراق میں دنیا
کے حاصل کرنے اور اس کے لٹا
دینے میں بے طرح مشغول تھا، اور
بہت قرضدار ہو گیا تھا جس کو
جس چیز کی بھی خواہش ہوتی، بس
میری ہی طرف رخ کرتا، اور میں
اس فکر میں رہتا تھا کہ کیسے سب کی
خواہش پوری کر دوں، کہ شیوخ وقت
میں سے ایک شیخ نے مجھے لکھا کہ اے

بہ فراغت دلے کہ مشغول ہواست
پس اگر دے یابی عزیز تر از دل خود
روا باشد کہ بفراغت آں دل دل
خود را مشغول گردانی والاکہ دست
ازآں کار بدار کہ بندگان خدا را
خدا بسندہ باشد واندر وقت را
بدیں سخن فراغتے پدید آمد (ص ۲۶۵)

فرزند کہیں اپنے دل کو مشغولیٔ خدا سے
ہٹاکر اسکی طرف مشغول نہ کرلینا جو مشغول ہوائے
نفس ہے، ہاں اگر کوئی ایسا شخص ملے جس کا
دل تم سے برتر ہو جیب تو اسکی تشفی خاطر کرو
ورنہ سب کے لئے اپنا دل حیران و پریشان
نہ رکھو اللہ خود ہی اپنے بندوں کے لئے کافی
ہے، اس وقت سے میرے دل کو قرار آگیا

قید از دواج سے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ہمیشہ آزادی رہی، البتہ ایک مقام پر آپ بیتی یوں بیان کرتے ہیں کہ جیسے غائبانہ کسی سے تعلقات محبت قائم ہوگئے تھے، اور یہ ایک سال تک اس زخم لطیف کے بسمل بنے رہے، پھر آخر اس سے نجات مل گئی، بیان ہے اتنا مجمل کہ تفصیلات کا کچھ پتہ نہیں چلتا، لکھا ہے کہ

من کہ علی بن عثمان الجلابی ام از
پس آنکہ مرا حق تعالیٰ یازدہ سال
از آفت تزویج نگاہ داشتہ بود ہم
تقدیر کرد تا بفتنہ اندر افتادم ظاہر
باطنم اسیر صفتے باشد کہ با من کردند
بے آنکہ رویت بودہ بود و یک سال مستغرق
آں بودم چنانچہ نزدیک بود کہ دین
برمن تباہ شود تا حق تعالیٰ بہ کمال
لطف و تمام فضل خود عصمت را
باستقبال دل بیچارۂ من فرستاد

مجھ علی بن عثمان جلابی کو اللہ نے
گیارہ سال تک تزویج کی مصیبت
سے محفوظ رکھا، اس کے بعد تقدیر
الٰہی یہ ہوئی کہ میں آزمائش میں
پڑ دل، چنانچہ بغیر شکل دیکھے، محض
دوسروں سے اوصاف سُن کر میرا
ظاہر و باطن اسی کی طرف گرفتار
رہا، یہانتک قریب تھا کہ میرا دین
تباہ ہوجائے کہ حق تعالیٰ نے
کمال لطف و کرم سے میری

بہ رحمت خلاصی ارزانی داشت (ص ۲۴۵) دستگیری کی۔

استعداد علمی کی تفصیل کسی تذکرہ میں نظر سے نہیں گذری، لیکن کشف المحجوب خود اس امر کا ایک واضح ثبوت ہے کہ اس کا مصنف علم باطن کے علاوہ علوم ظاہری پر بھی وسیع نظر رکھتا ہے، بعض تذکروں میں اجمالاً صرف اتنا ہے کہ جامع بود میان علوم ظاہر و باطن،، اور اتنا تو یقیناً صحیح معلوم ہوتا ہے۔

بعض تذکروں میں ہے کہ لاہور اپنے پیرومرشد کے حکم سے آئے تھے، اور حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء دہلویؒ کے ایک ملفوظ میں تو ورود لاہور کی تفصیل بھی ملتی ہے، فوائد الفواد میں ہے کہ علی ہجویری اور شیخ حسین زنجانی دونوں ایک ہی مرشد سے بیعت رکھتے تھے، شیخ حسن زنجانی عرصہ سے لاہور میں سکونت رکھتے تھے، ایک روز شیخ علی ہجویریؒ کو مرشد کا حکم ملا کہ لاہور میں سکونت اختیار کرو عرض کیا کہ وہاں تو شیخ حسین پیشتر سے موجود ہیں، مکرر ارشاد ہوا کہ تم جاؤ، تعمیل کی، شب میں لاہور پہونچے، اسی شب میں شیخ حسین نے انتقال کیا (ص ۳۵)

ان روایتوں سے تو معلوم ہوتا ہے کہ لاہور کو مرشد کے حکم سے اپنا مسکن بنایا تھا، لیکن کشف المحجوب سے کچھ ایسا پایا جاتا ہے کہ لاہور کا قیام مرضی کے خلاف کسی مجبوری سے تھا، فرماتے ہیں:۔

کتب من بہ حضرت غزنین مانده بود	میری کتابیں غزنی میں چھوٹ گئی تھیں
و من اندر دیار ہند در بلدۂ لاہور	اور میں حدود ہند میں شہر لاہور میں کہ
کہ از مضافات ملتان است در میان	مضافات ملتان میں سے ہے، ناجنسوں
ناجنساں گرفتار شده بودم (ص ۵۶)	کے درمیان گرفتار تھا۔

عام لقب جو گنج بخش چلا ہوا ہے، اس کی بابت روایت یہ ہے کہ خواجہ معین الدین حسن سنجری اجمیریؒ نے آپ کے مزار پر آکر حسب دستور صوفیہ چلہ کشی کی اور فیض و برکت سے

مالامال ہو کر جب رخصت ہونے لگے تو مزار کے رُخ کھڑے ہو کر یہ شعر پڑھا ؎

گنج بخش ہر دو عالم مظہر نور خدا   کاملاں را پیر کامل ناقصاں را رہنما

سال وفات سے متعلق اختلاف ہے، مزار پر جو قطعۂ تاریخ کندہ ہے، اس میں ۴۶۵ھ درج ہے، دوسرے قرینے بھی اسی کی تائید میں ہیں، مزار لاہور میں سمت غرب میں واقع ہے، اب تو آبادی وہاں تک ہو گئی ہے، پہلے شہر سے باہر تھا، اہل حاجت یوں بھی برابر آتے جاتے رہتے ہیں، جمعرات اور جمعہ کو مجمع زائد ہو جاتا ہے، عقیدتمندوں کا خیال ہے اگر چالیس روز متصل حاضری دیجائے یا چالیس جمعہ کی راتوں کو مزار کا طواف کیا جائے تو ہر مشکل آسان اور ہر حاجت روا ہو جاتی ہے، زیارت ایک بار ۱۹۴۲ء / ۱۳۶۱ھ میں ان سطور کے راقم آثم نے بھی کی ہے خلاف شریعت بدعتوں کا مرکز جس طرح ہر بڑی درگاہ ہے، یہ مزار بھی ہے،

تصوف و طریق پر کتابیں متعدد لکھیں، لیکن آج وہ ناپید ہیں، بلکہ تذکروں میں تو ان کے نام تک درج نہیں، سفینۃ الاولیاء وغیرہ میں اجمالی ذکر صرف اس قدر آتا ہے کہ "حضرت پیر علی ہجویری را تصانیف بسیار است"، نکلسن نے خود کشف المحجوب کے اندر ڈوب کر ذیل کی کتابوں کا پتہ تو لگا ہی لیا ہے،

۱۔ دیوان۔ "یکے آنکہ دیوان شعر کسے برخاست" (کشف، ص۱)

۲۔ منہاج الدین۔ "دیگر کتابے تالیف کردم اندر طریق تصوف، نام آں منہاج الدین (ص۲) و پیش ازیں کتابے ساختہ ام، مرآں را منہاج الدین نام کردہ اند، اندر وے مناقب و اہل صفہ یک یک بہ تفصیل آوردہ" (ص۵) نیز "اندر کتابے کہ کردہ ام جزایں منہاج نام" (ص۱۱۱)

۳۔ کتاب الفناء والبقاء۔ "مراد ازیں جنس سخن است اندر کتابے فنا و بقا (ص۲۰۴)"

۴۔ اسرار الخرق والمؤنات۔ "مرا اندریں باب کتابے کہ نام آں اسرار الخرق

والمودنات ست و نسخہ آں مرید را باید" (صہ ۳۹)

۵۔ کتاب البیان لاہل العیان "من اندریں معنی تا حال ہدایت کتابے ساختہ ام و آں را کتاب البیان لاہل العیان نام کردہ شد۔" (صہ ۱۹۵)

۶۔ بحر القلوب۔ "اندر بحر القلوب اندر باب جمع فصولے مشبعہ گفتہ ام (صہ ۱۹۵)

۷۔ الرعایۃ لحقوق اللہ۔ طالب ایں علم را ایں مسئلہ از کتاب دیگر باید طلبید کہ کردہ ام، آں را الرعایۃ لحقوق اللہ نام کرد۔" (صہ ۲۱۱)

کشف کی دو عبارتوں میں کتابوں کے حوالے اور بھی ہیں۔ اب خدا معلوم ان سے مراد انہی مذکورہ بالا کتابوں میں سے کوئی دو ہیں یا یہ دو ان کے علاوہ ہیں،

"پیش ازیں اندر شرح کلام وے (منصور حلاج) کتابے ساختہ ام" (صہ ۱۱۱)

"من اندر بیان ایں (ایمان) کتابے کردہ جداگانہ۔ (صہ ۱۵۷)

اگر یہ دو کتابیں ان کے علاوہ ہیں، (جیسا کہ نکلسن کا خیال ہے) تو مجموعی تعداد نو کتابوں کی ہوتی ہے، اور ایک خود یہی کشف المحجوب، کل دس ہوئیں اور چونکہ یہ بھی نہیں معلوم کہ کشف کی تصنیف کب ہوئی، اور شیخ اس کے بعد کب تک زندہ رہے، اسلئے ہو سکتا ہے کہ ان دس پر بعد میں کچھ اور بھی اضافہ ہوا ہو،

مخدوم کے رتبۂ کمال کا اعتراف سب کو رہا ہے، خواجۂ خواجگان معین الدین چشتی اجمیریؒ اور شیخ المشائخ فرید الدین گنج شکرؒ دونوں سے متعلق روایت ہے کہ آپ کے مزار پر جا کر چلے کھینچے ہیں اور فیوض و برکات حاصل کئے ہیں، چنانچہ دونوں حضرات کے مکانات میں چلہ کشی کے نقوش اب تک محفوظ ہیں،

ملا جامیؒ ان الفاظ میں تصنیف و مصنف کی جلالت قدر کا اعتراف کرتے ہیں:۔

"عالم و عارف بود...... در صحبت بسیارے از مشائخ دیگر رسیدہ است، صاحب کتاب کشف المحجوب است کہ از کتاب مشہورہ معتبرہ دریں فن است۔"

لطائف و حقائق بسیار در آں کتاب جمع کردہ است۔" (نفحات صفحہ ۱۵۸)

دارا شکوہ کے نزدیک فارسی زبان میں تصوف پر کوئی کتاب اس ٹکر کی نہیں:۔

"خانوادۂ ایشاں خانوادۂ زہد و تقویٰ بود، حضرت پیر علی ہجویریؒ را تصانیف بسیار است اما کشف المحجوب مشہور و معروف است و ہیچکس را براں سخن نیست و مرشدے ست کامل، در کتب تصوف بہ خوبی آں در زبان فارسی تصنیف نہ شدہ خوارق و کرامات زیادہ از حد و نہایت، و بارہا بر قدم تجرید و توکل سفر کردہ اند۔" (سفینہ صفحہ ۱۶۴)

سب سے بڑھ کر قابل استناد و قابل افتخار قول سلطان المشائخ نظام الملت نظام الدین اولیاءؒ کی جانب منسوب ہے، آپ کا ارشاد نقل ہوا ہے کہ جس کا کوئی مرشد نہ ہو، اس کو کشف المحجوب کے مطالعہ کی برکت سے مل جائے گا، آپ کا ایک غیر مطبوعہ ملفوظ درر نظامی اس میں ہے۔

"می فرمودند، کشف المحجوب از تصنیف شیخ علی ہجویری ست، قدس اللہ روحہ العزیز، اگر کسے را پیرے نہ باشد چوں ایں کتاب را مطالعہ کند او را پیدا شود، من ایں کتاب را بہ تمام مطالعہ کردہ ام۔"

مخدومؒ کی اس کرامت کا ذکر متعدد تذکروں میں ہے کہ لاہور میں جو مسجد آپ نے تعمیر کرائی تھی۔ اس کی محراب میں بمقابلہ دوسری مسجدوں کے سمت جنوب میں ذرا کجی تھی، علمائے وقت نے اعتراض کیا کہ سمت قبلہ قائم نہیں رہی، آپ نے ایک روز سب کو جمع کر کے خود نماز پڑھائی، اس کے بعد حاضرین سے کہا دیکھ لو کعبہ کدھر ہے، حجابات اٹھ گئے، سب نے دیکھ لیا کہ بیت اللہ مسجد کے ٹھیک مقابل ہے۔

لہ درر نظامی۔ مرتبہ شیخ علی محمود جاندار، نسخہ قلمی، مملوکہ سید علیم الدین مرحوم خادم درگاہ سلطان المشائخ، دہلی۔

(ب) تصنیف

عربی میں تصوف کی قدیم ترین معلوم و موجود کتاب کا نام کتاب اللمع تھا، اس سے ہم پچھلے باب میں روشناس ہو چکے، فارسی میں تصوف کی قدیم ترین موجود کتاب کشف المحجوب ہے، کتاب اللمع چند سال قبل دنیا کے لئے معدوم تھی، اور اب بھی مشرق کے لئے اس کا وجود اس کے عدم سے کچھ ہی بہتر ہے، خوش قسمتی سے کشف المحجوب اس حجاب گمنامی میں نہیں، داتا گنج بخش لاہوری کا نام تو اس سے زیادہ عوام کی زبان پر ہے، پنجاب کے اکثر گھرانے ان کی عقیدت کے ممکن ہیں، لاہور میں مدت ہوئی اصل فارسی نسخہ طبع ہو چکا ہے، اردو ترجمہ بھی لاہور ہی سے نکل چکا ہے، انگریزی ترجمہ پروفیسر نکلسن نے گب میموریل سیریز میں شائع کیا ہے، چند سال ہوئے روس (سینٹ پٹرزبرگ) کے پروفیسر ژوکوفسکی کے زیر اہتمام اصل کتاب کے یورپ میں بھی چھپنے کی اطلاع آئی تھی، یہ سب کچھ ہے، تاہم استفادہ کرنے والوں کا حلقہ اب بھی محدود ہے، اور مصنف کی طرح تصنیف سے بھی تعارف کرانے کی ضرورت ابھی باقی ہے،

مصنفؒ کی رحلت کا سال ۴۶۵ھ ہے، اور مصنفؒ نے اس کتاب میں اپنی متعدد پچھلی کتابوں کا ذکر اور سکونت لاہور کا ذکر کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب ان کی آخر عمر کی تصنیف ہے، یعنی پانچویں صدی ہجری کا وسط، اس کتاب کے تقریباً ہم عمر امام ابو القاسم قشیریؒ کا عربی رسالہ القشیریہ ہے، موضوع اس کا بھی تصوف ہے، دونوں کے طرز تصنیف میں فرق یہ ہے کہ امام موصوف نے

زیادہ تر متقدمین کے اقوال وحکایات کے نقل کر دینے پر اکتفا کی ہے، برخلاف اس کے مخدوم ہجویری ایک مجتہدانہ انداز سے اپنے ذاتی تجربات، مکاشفات، واردات، مجاہدات وغیرہ بھی قلمبند کرتے جاتے ہیں، اور مباحث سلوک پر رد قدح کرنے میں تامل نہیں کرتے، اس لئے ان کی کتاب کی حیثیت محض ایک مجموعۂ روایات وحکایات کی نہیں بلکہ ایک مستند محققانہ تصنیف کی ہے۔

صورت تصنیف یہ ہے کہ کوئی صاحب ابوسعید ہجویری نامی سائل ہیں، انھوں نے حضرت مخدومؒ میں عرض کیا ہے کہ

بیان کن مرا اندر تحقیق طریق تصوف	مجھ سے بیان فرمائیے طریق تصوف کی
و کیفیت مقامات ایشاں و بیان	حقیقت اور مقامات صوفیہ کی کیفیت
مذاہب و مقالات آں و اظہار	اور ان کے عقائد و مقالات کی تشریح،
کن مرا رموز و اشارات ایشاں و	اور مجھ پر ظاہر کیجئے ان کے رموز اور
چگونگی، محبت خدائے عز و جل و	اشارے اور خدائے بزرگ کیساتھ انکی
کیفیت اظہار آں بر دلہا و سبب	محبت کی نوعیت، اور دلوں میں اسکی
حجاب عقول از کنہ ماہیت آں و	ماہیت کے ادراک سے عقل کا حجاب
نفرت نفس از حقیقت آں و آرام	اور نفس کی اسکی طرف سے بیزاری اور
روح با صفوت آں و آنچہ بدیں تعلق	روح کی اسکی طرف سے تسکین اور اس
دارد و از معاملات آں (ص ۶)	کے معاملات کے متعلقات

ساری کتاب اسی سوال کے جواب اور انہی مراتب کی تفصیل میں ہے،

مضامین اور تصانیف کے سرقہ میں معلوم ہوتا ہے، اس وقت اور اس زمانہ کے لوگ بڑے شاطر تھے، شیخ کو ایک نہیں دو مرتبہ ان لوگوں کے ہاتھوں تلخ تجربے اٹھانے پڑے، ایک مرتبہ کوئی صاحب شیخؒ سے مسودہ دیوان مانگ کر لے گئے اور بجائے

واپس کرنے کے اپنے نام اور تخلص کے ساتھ اسکی اشاعت شروع کر دی دوسری مرتبہ یہ اتفاق ہوا کہ ان کی ایک تصنیف فن سلوک میں منہاج الدین کے نام سے تھی، اُسے کوئی شخص اڑا لے گیا، ان کا نام کاٹ کر عنوان پر اپنا نام لکھ دیا، اور اس کی تصنیف کو اپنی جانب منسوب کرنا شروع کر دیا، کشف المحجوب ان تصانیف کے بعد کی ہے، اس کے آغاز میں جہاں اپنا نام لکھا ہے، وہاں ان سب تلخ حالات کی تصریح بھی تلخ لب ولہجہ میں فرمادی ہے، (ص ۱-۲)

اس سرقہ سے اس قدر خائف تھے، کہ اسی ایک بار پر اکتفا نہیں، بلکہ درمیان کتاب میں بار بار اپنا پورا نام لیتے گئے ہیں۔

لاہور کا جو مطبوعہ نسخہ پیش نظر ہے، اس کا کہنا چاہیئے کہ کوئی صفحہ مطبعی غلطیوں سے خالی نہیں۔ کہیں عبارت بالکل بے معنی ہو گئی ہے، کہیں مصنف کے اصل منشا کے خلاف مفہوم نکل رہا ہے، اور اس سے بڑھ کر ستم یہ ہے کہ اکثر مقامات پر اشخاص و مقامات کے نام بالکل مسخ ہو گئے ہیں، ان کی تصحیح کی کوئی صورت نہیں، دوسرا تکلیف دہ امر اس نسخہ میں یہ ہے، کہ کسی قسم کی فہرست مضامین وغیرہ درج نہیں، کتاب مقدمہ، بابوں اور فصلوں میں تقسیم ہے، ہر باب و فصل کے الگ الگ پیراگراف (بند یا فقرے) ہیں، لیکن کاتب صاحب نے بائے بسم اللہ سے لیکر تائے تمت تک ۴۴۳ صفحہ کی کتاب کا نظم بالکل یکساں رکھا ہے، نہ کہیں کوئی پیراگراف (بند) توڑا ہے، نہ ایک باب و فصل کے اختتام کو دوسرے کے آغاز سے نمایاں طور پر ممتاز کیا ہے۔ راقم سطور نے بطور خود ایک فہرست مضامین اور بعض دوسری فہرستیں مرتب کیں اور انہی کی مدد سے ناظرین کے ہمراہ کتاب پر ایک سرسری نظر کرنا ہے۔

شروع کے چھ صفحے (صفحہ ۳-۸) بہ طور تمہید یا مقدمہ کے ہیں، ان میں سبب تالیف، موضوع سخن وغیرہ کا بیان ہے، اس کے بعد ترتیب مضامین حسب ذیل ہے:-

(۱) فی اثبات العلم (صفحہ ۱۴)

اس میں علم کی ماہیت، علم کے فضائل اور علم کے اقسام کا بیان ہے، مشہور صوفی حاتم اصم کا قول نقل کیا ہے کہ

حاتم الاصم گفت رضی اللہ عنہ کہ
چہار علم اختیار کردم واز ہمہ علمائے
عالم برستم ..... یکے آنکہ بدانستم کہ مرا
رزقے ست مقسوم کہ زیادت وکم نشود
از طلب زیادت برآسودم ودیگر آنکہ
بدانستم کہ خدائے را برمن حقے است کہ
جز من کسے دیگر نتواند گزارد، بہ ادائے
آں مشغول گشتم، دیگر آں کہ دانستم کہ
مرا طالبے ست یعنی مرگ کہ از وے نتوانم
گریخت آں را بساختم، چہارم آں کہ
دانستم کہ مرا خداوندے ست مطلع برمن
از وے شرم داشتم واز ناکردنی دست
باز داشتم، (صفحہ)

تمام علوم عالم میں سے میں نے چار چیزوں
کا علم حاصل کر لیا، اور باقی علوم سے
بے نیاز ہو گیا، اول یہ کہ رزق کی ایک مقدار
مقسوم ہے اس میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی، اس لئے
اس میں اضافہ کی طلبگاری سے نجات پا
گیا، دوم یہ کہ خدا کی جانب سے میرے
اوپر جو حق عائد ہیں، انکی بجا آوری میرے
اوپر فرض ہے (نہ کہ کسی اور پر) اس سے انکی
ادائی میں مشغول ہو گیا ہوں، تیسرے یہ کہ
میرے تعاقب میں موت لگی ہوئی ہے، جس سے
کسی طرح گریز ممکن نہیں اسلئے اس سے ملنے
کی تیاری کرتا رہتا ہوں چوتھے یہ کہ خدا میرے
حال کو دیکھتا رہتا ہے، اسلئے اس سے شرم
کرتا اور ممنوعات سے بچتا رہتا ہوں۔

علم صحیح یا معرفت کے لئے علم ظاہر یا شریعت اور علم باطن یا طریقت کی حاجت ضروری ہے، صرف ایک کا وجود طالب کے لئے مضر ہوگا،

ظاہر ورزش معاملت وباطنش تصحیح
نیت وقیام ہر یک ازیں بے دیگرے

ظاہر سے مراد معاملات ہیں اور باطن
سے تصحیح نیت، ان میں سے ایک کا وجود

محال باشد، ظاہر بے حقیقت باطن
نفاق بود و باطن بے ظاہر زندقہ،
و ظاہر شریعت بے باطن نقص بود
و باطن بے ظاہر ہوس، پس علم حقیقت
را سہ رکن است، یکے علم بذات خداوند
تعالیٰ و وحدانیت وے و نفی تشبیہ
از وے دیگر علم بہ صفات خداوند
تعالیٰ و احکام آن و سہ دیگر علم بہ افعال
و حکمت وے، و علم شریعت را نیز
سہ رکن است، یکے کتاب، دیگر سنت
سہ دیگر اجماع امت، (صفحہ)

بغیر دوسرے کے محال ہے، ظاہر بغیر
امتزاج باطن کے منافقت ہے،
اور باطن بغیر شمول ظاہر کے زندقہ ہو
شریعت کا ظاہر بلا باطن نقص ہے اور
باطن بلا ظاہر ہوس ہے، تو علم حقیقت
کے تین رکن ہوئے، ایک علم ذات
خداوندی، توحید و نفی تشبیہ دوسرے
علم صفات و احکام خداوندی تیسرے
علم افعال و حکمت افعال خداوندی،
علم شریعت کے بھی یہی تین رکن ہیں،
ایک کتاب دوسرے سنت تیسرے اجماع امت،

علم ذات خداوندی کی تعلیم اس قسم کی آیات قرآنی میں بکثرت ملتی ہے،

فاعلم انہ لا الہ الا اللہ، واعلموا ان اللہ ہو مولٰکم، الم تر الی ربک کیف مد الظل، افلا ینظرون الی الابل کیف خلقت، لیس کمثلہ شیء وہو السمیع البصیر۔

نیز اس قسم کی احادیث نبوی ہیں کہ من علم ان اللہ تعالیٰ ربہ و انی نبیہ حرم اللہ تعالیٰ لحمہ و دمہ علی النار،

علم صفات خداوندی کی جانب رہبری اس قسم کی آیات کرتی ہیں:۔

ان اللہ علیم بذات الصدور، واللہ علی کل شیء قدیر، وہو السمیع البصیر، فعال لما یرید، ہو الحی لا الہ الا ہو،

علم افعال خداوندی کی بابت اشارے اس قسم کی آیات میں ملتے ہیں،

وَاللہ خلقکم وما تعلمون، وَاللہ خالق کل شیٔ

علم شریعت کے رکن اوّل یعنی کتاب اللہ سے تمسک و اعتصام کی دلیل یہ ارشاد ربانی ہے، فیہ آیات محکمات ھن ام الکتاب رکن دوم یعنی سنت نبوی کا شاہد عادل یہ فرمان الٰہی ہے، وما آتکم الرسول فخذوہ وما نھٰکم عنہ فانتھوا، رکن سوم یعنی اجماع اُمت کی دستاویز استناد یہ ارشاد حضرت رسالتؐ ہے کہ لا یجتمع امتی علی الضلالتہ علیکم بالسواد الاعظم،

علم، بہ شمول علم شریعت کی اہمیت پر جتنا زور دیا ہے اس مزید اندازہ اقتباس ذیل سے ہوگا۔

محمد بن فضل البلخی گوید رحمتہ اللہ علیہ العلوم ثلاثۃ علم من اللہ و علم مع اللہ و علم باللہ علم باللہ علم معرفت بود کہ ہمہ اولیاء و انبیاء بدو دانستہ اند و تا تعریف و تعرف وے نبود ایشاں وے را نہ دانستند علم من اللہ علم شریعت بود کہ آں از وے بما فرمان و تکلیف ست و علم مع اللہ علم مقامات و طریق حق و بیان درجات اولیا است پس معرفت بے پذیرفتن شریعت درست نیاید و ورزش شریعت بے اظہار مقامات راست نیاید... ہر کرا

محمد بن فضل بلخی کہتے ہیں کہ علم کی تین قسمیں ہیں، ایک علم من اللہ، دوسرے علم مع اللہ، تیسرے علم باللہ، علم باللہ علم معرفت ہے کہ انبیاء و اولیائے اسی ذریعہ سے معرفت باری حاصل کی ہے، اور بغیر اس کے انھیں معرفت حاصل نہ ہو سکی، علم من اللہ علم شریعت ہے یعنی احکام الٰہی و فرائض عبدیت کا علم، علم مع اللہ علم مقامات طریقت و درجات اولیاء کا نام ہے، معرفت بغیر علم شریعت کے قبول کئے درست نہیں ہو سکتی، اور شریعت پر عمل بغیر مقامات رسی کے پورا نہ ہو پائے گا اور جسے علم معرفت

علم معرفت نیست دلش بجہل	نہیں اس کے قلب پر جہل کی موت
مردہ ست و ہر کرا علم شریعت	طاری ہے، اور جسے علم شریعت
نیست بر نادانی بیمار ست۔	نہیں اس کا قلب مرض نادانی
(صفحہ ۱۲)	میں گرفتار ہے،

اسی تعلیم کی تائید میں بایزید بسطامی کا قول ہے کہ

عملت فی المجاہدۃ ثلثین سنۃ	میں نے تیس سال تک مجاہدہ کئے،
فما وجدت شیئاً اشد علی	لیکن کسی مجاہدہ کو علم و تحصیل علم
من العلم ومتابعتہ	سے بڑھ کر سخت نہیں پایا"

اور خود شیخ ہجویری کا بیان ہے کہ طبع انسانی کے لئے آگ پر چلنا راہ علم پر چلنے سے آسان تر ہے، اور ایک جاہل کے لئے پل صراط پر ہزار بار گذرنا اس سے آسان ہے، کہ علم کا ایک مسئلہ حل کرے، (صفحہ ۱۲)

آج جب کہ بعض خوش فہم صوفیہ نے ہر قسم کے علم پر مطلق صورت میں حجاب اکبر کا حکم لگا دیا ہے، علم شریعت کے یہ فضائل ایک شیخ الشیوخ کی زبان سے یقیناً حیرت کے کانوں سے سنے جائیں گے،

(۲) الباب الثانی فی الفقر، (صفحہ ۱۴-۲۴)

اس باب میں فضائل فقر و مسکنت کا بیان ہے، فضائل فقر میں متعدد آیات قرآنی موجود ہیں، مثلاً

للفقراء الذین احصروا فی سبیل اللہ لا یستطیعون ضرباً فی الارض یحسبھم الجاھل اغنیاء من التعفف (بقرہ۔ع۔۳۷)

تتجافی جنوبھم عن المضاجع یدعون ربھم خوفاً وطمعاً (سجدہ۔ع۲)

احادیث نبوی میں بھی فضائل فقر کثرت سے وارد ہوئے ہیں، سرور کائنات صلعم خود

اپنے متعلق دعا میں یہ آرزو کیا کرتے تھے، کہ اے پروردگار مجھے مسکین زندہ رکھ، مسکین ہی وفات دے، حشر میں زمرۂ مساکین ہی میں اٹھا، ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ قیامت کے روز ارشاد باری تعالیٰ ہوگا کہ

ادنونی احبائی فیقول الملٰئکۃ من احباءک فیقول اللہ الفقراء والمساکین، — میرے دوستوں کو حاضر کرو، فرشتے عرض کریں گے کہ بار الٰہا تیرے دوست کون ہیں؟ ارشاد ہوگا کہ فقراء و مساکین،

عہد رسالت میں جو فقراء مہاجرین مسجد نبوی میں اسباب دنیوی سے قطع نظر کرکے محض عبادت الٰہی کے لئے بیٹھ گئے تھے، اور اپنے رزق کیلئے تکیہ محض مسبب الاسباب پر رکھے ہوئے تھے، ان کی خبرگیری اور ان کی رفاقت کے لئے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بارگاہ رب العزت سے تاکید ہوتی تھی، چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے،

ولا تطرد الذین یدعون ربھم بالغداوۃ والعشی یریدون وجھہ (انعام۔ آیت ۵۲)

اور ایک دوسرے موقع پر فرمان ملتا ہے:۔

ولا تعد عیناک عنھم ترید زینۃ الحیٰوۃ الدنیا (کہف، آیت ۲۸)

ان تاکیدی احکام نے ان فقراء مہاجرین کو اس مرتبہ پر پہونچا دیا تھا کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم جہاں کہیں انھیں دیکھ لیتے تو انتہائے شفقت سے ارشاد فرماتے کہ میرے ماں باپ تم پر فدا ہوں، کہ اللہ نے تمھارے بارے میں مجھ پر عتاب کیا! (صفحہ ۱۴-۱۵)

اس کے آگے فقر کی حقیقت اور فقر کے آداب پر بحث کی ہے، اور غنا کے مقابلہ میں اس کی افضلیت پر دلائل قائم کئے ہیں۔

(۳) الباب الثالث فی التصوف (صفحہ ۲۴-۳۱)

تیسرا باب ماہیت تصوف پر ہے، حسب معمول شیخ نے اس باب کا بھی آغاز قال اللہ و قال الرسول سے کیا ہے، چنانچہ کلام الٰہی میں انھیں اس باب کے مطابق و مناسب یہ آیت ملی،

وعباد الرحمن الذین یمشون علی الارض ھونا واذا خاطبھم الجاھلون قالوا سلاماً (الفرقان، آیت ٦٣)

اور بطور حدیث کے اس کو پیش کیا ہے جو حدیث رسولؐ تو نہیں، البتہ کسی بزرگ امت کا مقولہ معلوم ہوتا ہے،

من سمع صوت اھل التصوف فلا یؤمن علی دعائھم کتب عند اللہ من الغافلین،

اس کے آگے شیخ سراجؒ کی طرح اُنھوں نے بھی لفظ صوفی اور اس کے اشتقاق پر تفصیلی نظر کی ہے۔

مردمان اندر تحقیق ایں اسم بسیار سخن گفتہ اند و کتب ساختہ و گروہے ازاں گفتہ اند کہ صوفی را ازاں صوفی خواندہ اند کہ جامۂ صوف دارد و گروہے گفتہ اند کہ صوفی را ازاں صوفی خوانند کہ از صف اول باشد و گروہے گفتہ اند کہ بداں صوفی گویند کہ تولا بر اصحاب صفہ رضی اللہ عنہم کردہ اند و گروہے گفتہ اند کہ ایں اسم از صفا مشتق

اس نام کی تحقیق میں لوگوں کے مختلف خیالات ہیں اور بہت سے قول ہیں، ایک گروہ کے نزدیک چونکہ یہ لوگ جامۂ صوف میں ملبوس رہتے تھے، اس لئے صوفی کہلائے، بعض کا خیال ہے کہ لفظ صوفی کا ماخذ صف اول ہے، یہ حضرات چونکہ صف اول میں رہتے تھے، اس لئے لقب صوفی سے موسوم ہوئے، ایک گروہ کا مسلک ہے کہ چونکہ ان لوگوں کو اصحاب صفہ سے

است و ہر کسے را اندریں معنی
اندر تحقیق این طریقت لطائف
بسیار است اما بہ مقتضائے
لغت ازیں معنی بعید می باشد
(صفحہ ۲۲)

خاص محبت تھی اس لئے یہ صوفی کہلائے
ایک اور جماعت اس لفظ کا اشتقاق
لفظ صفا سے بتاتی ہے اور ہر گروہ اپنی
تائید میں خوب خوب نکتے پیدا کرتا رہتا
ہے لیکن لغت سے کسی قول کی بھی تائید
نہیں ہوتی ۔

شیخ کے نزدیک صوفی وہ ہے جس کا قلب "صفا" (صفائی) سے لبریز ہو اور "کدر" (گندگی) سے خالی ہو، اور اس مرتبہ تک کاملان ولایت ہی پہونچ سکتے ہیں

"صفا ضد کدر بود و کدر صفت بشر بود، وحقیقت صوفی بود آنکہ او را از کدر گذر بود۔" (صفحہ ۲۳)

"صوفی نامے ست کہ مر کاملان ولایت را و محققاں بدیں نام خواندہ اند[۲۵]

چنانچہ دور اول کے مشائخ طریقت میں سے کسی بزرگ کا قول ہے کہ

من صفاہ الحب فہو صاف و
من صفاہ الحبیب فہو صوفی
(صفحہ ۲۵)

جس کسی کو محبت صاف کر دے وہ
صافی ہے اور جسے محبوب اپنے لئے
صاف کر لے وہ صوفی ہے ۔

اہل تصوف کے تین طبقے یا درجے ہیں، صوفی، متصوف، مستصوف، تینوں کی تعریف شیخ ہی کے لفظوں میں سننے کے قابل ہے:-

صوفی آں بود کہ از خود فانی
بود و بحق باقی و از قبضۂ طبائع
رستہ و بہ حقیقت پیوستہ او
متصوف آنکہ بمجاہدہ ایں درجہ را

صوفی وہ ہے جو اپنے نفس سے فانی
ہو کر حق میں زندہ و باقی ہو اور مادیت
گذر کر حقیقت تک رسائی حاصل کر چکا ہو
اور متصوف وہ ہے جو مجاہدہ کر کے

همی طلبند و اندر طلب خود در ابر
معاملت ایشاں درست همی کنند
و متصوف آنکه از برائے مال و
منال و جاه و حظ دنیا خود را
مانند ایشاں کرده و ازیں هر دو
چیز، هیچ خبر ندارد تا حدے که
گفته اند المستصوف عند الصوفیة
کالذباب و عند غیرهم کالذئاب،
(صفحہ ۲۵)

یہ راہ طے کر رہا ہو، اور اس منزل تک
رسائی کی کوشش میں ہو، اور مستصوف وہ
ہے جو محض جاہ و مال کیلئے دنیا طلبی کی
خاطر، اپنے کو صوفیہ و متصوفہ کے مشابہ
بنالے، اور حقیقۃً ان دونوں سے بے
بہرہ نہ ہو، کسی نے خوب کہا ہے کہ مستصوف
صوفی کی نظر میں مکھی کی طرح حقیر ہوتا ہو
اور دوسروں کی نظر میں بھیڑیے کی مانند
جسکی غذا ہی گوشت اور خون ہے،

شیخ عالم معانی و حقائق ہی کے سیاح نہیں بلکہ شیخ سعدیؒ کی طرح لفظی صنعت گری کے بھی ماہر ہیں، اور کتاب میں ادب و انشاء کے جلوے بار بار دکھاتے گئے ہیں، یہاں بھی آگئے جو عبارت لکھی ہے، نمونہ کے طور پر ملاحظہ ہو:-

صوفی صاحب وصول بود و متصوف
صاحب اصول و مستصوف صاحب
فضول،

صوفی صاحب وصول ہوتا ہے کہ اسے
وصل مقصود ہو چکا ہوتا ہے، متصوف
صاحب اصول ہوتا ہے کہ اصل صحیح
پر قائم رہ کر احوال طریقت میں
مشغول رہتا ہے، اور مستصوف
صاحب فضول ہوتا ہے کہ اس
کی قسمت میں حقیقت سے محجوبی
اور معانی سے محرومی ہوتی ہے،

قدیم ائمہ صوفیہ نے صوفی اور تصوف کی جو تعریفات بیان کی ہیں، شیخ نے انھیں بھی

سند اً پیش کیا ہے، اور دور تک انھیں پیش کرتے چلے گئے ہیں، (صفحہ ۲۶-۱۹) مثلاً

(۱) الصوفی اذا نطقہ بان نطقہ عن الحقائق وان سکت نطقت عنہ الجوارح بقطع العلائق (ذوالنون مصریؒ)

حضرت ذوالنون مصریؒ کہتے ہیں کہ صوفی وہ ہے کہ جب وہ گفتار میں آتا ہے تو اسکی زبان حقائق کی ترجمان ہوتی ہے، اور جب خاموش ہوتا تو اسکے اعضا قطع علائق پر زبان حال سے شہادت دیتے رہتے ہیں۔

(۲) التصوف نعت اقیم العبد فیہ قیل نعت للعبد ام للحق فقال نعت الحق حقیقۃ ونعت العبد رسماً (جنیدؒ بغدادی)

حضرت جنیدؒ بغدادی کا ارشاد ہے کہ تصوف وہ صفت ہے، جس میں بندہ کی اقامت کی گئی (یعنی اس کی ہستی ہے) لوگوں نے پوچھا کہ یہ صفت بندہ کی ہے یا حق کی؟ جواب دیا کہ حقیقۃً تو حق کی ہے صورۃً بندہ کی ہے،

(۳) التصوف ترک کل حظ للنفس (ابوالحسن نوریؒ)

حضرت ابوالحسنؒ نوری کا قول ہے کہ تصوف عام حظوظ نفسانی کے ترک کا نام ہے،

(۴) الصوفیۃ ھم الذین صفت ارواحھم نصاروا فی الصف الاوّل بین یدی الحق (ایضاً)

انہی بزرگ کا یہ بھی قول ہے کہ صوفی وہ لوگ ہیں جن کی روحیں (آلائشوں) سے پاک ہو چکی ہیں، اور وہ رب العزت کے حضور میں صف اوّل میں حاضر ہیں۔

(۵) الصوفی الذی لایملك ولا یملك (ایضاً)

انہی بزرگ سے یہ بھی منقول ہو کہ صوفی وہ ہے جو نہ خود کسی چیز کا مالک ہو اور نہ کوئی اس کا مالک ہو،

(۶) التصوف رؤیۃ الکون بعین النقص بل غض الطرف عن الکون (ابو عمرو دمشقیؒ)

ابو عمرو دمشقیؒ ارشاد کرتے ہیں کہ تصوف نام ہے کائنات کی جانب عیب جوئی کی نگاہ سے دیکھنے کا، بلکہ سرے سے نہ دیکھنے کا،

(۷) التصوف شرك لانہ صیانۃ القلب عن رؤیۃ الغیر ولا غیر (شبلیؒ)

شیخ شبلیؒ فرماتے ہیں کہ تصوف ایک طرح کا شرک ہے، اسلئے کہ یہ نام ہے قلب کو "غیر" سے بچانے کا، حالانکہ "غیر" کا وجود ہی سرے سے نہیں،

(۸) التصوف صفاء السر من کدورۃ المخالفۃ (حصریؒ)

شیخ حصریؒ کا ارشاد ہے کہ تصوف نام ہے قلب کو مخالفت حق کی کدورت سے پاک رکھنے کا،

(۹) الصوفی لایری فی الدارین مع اللہ غیر اللہ (شبلیؒ)

شبلیؒ سے یہ ارشاد بھی منقول ہو کہ صوفی دونوں جہانوں میں اللہ کے سوا اور کسی کو نہیں دیکھتا،

(۱۰) التصوف اسقاط الرؤیۃ للحق ظاهراً وباطناً، (علی بن بندار نیشاپوری)

شیخ علی بن بندار نیشاپوری کا ارشاد ہے کہ تصوف یہ ہے کہ بجز حق ہی حق کے ظاہر اور باطن میں اور کچھ نہ نظر آئے،

اسی باب میں اہل تصوف کے مزید خصوصیات، ان کے معاملات اور انبیاء علیہم السلام کی پیروی میں ان کی کوششوں کو بیان کیا ہے،

(۴) باب فی لبس المرقعات (صفحہ ۳۱-۳۹)

اس چوتھے باب میں مرقع پوشی، یعنی پیوند لگے ہوئے لبادہ اور گدڑی پہننے کی فضیلت کا ذکر ہے، اور اس دستور کو سنت رسولؐ اور آثار صحابہ سے ثابت کیا ہے،

(۵) باب فی ذکر اختلافہم فی الفقر والصفوۃ (صفحہ ۳۹-۴۲)

اس باب میں اس مسئلہ پر بحث ہے کہ فقر اور صفا دونوں میں افضل کون ہے؟ بعض صوفیہ نے فقر کو ترجیح دی ہے، اور بعض نے صفا کو، شیخ نے محاکمہ کرنا چاہا ہے پھر بھی بحث تشنہ رہ گئی ہے،

(۶) باب الملامت (صفحہ ۴۲-۴۷)

اس باب میں آیۂ قرآنی ولا یخافون لومۃ لائم ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء (مائدہ - آیت ۵۴) کی تفسیر میں طریق ملامت کی ستائش کی ہے، اور یہ دکھایا ہے کہ اہل حق راہ حق میں کسی ملامت کی پرواہ نہیں کرتے، بلکہ خلق کی نظر میں رسوا اور مطعون ہو کر اپنی للہیت اور حق پرستی کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں، اس طریق کے نشر و اشاعت کا سہرا شیخ ابو حمدون قصارؒ کے سر ہے،

حصول ملامت کی ممکن صورتیں تین ہیں،

(۱) پہلی صورت "راست رفتن" یعنی معمولی طور پر راہ راست پر چلتے رہنے کی ہے خلقت اس پر بھی اگر ملامت کرنے لگے، تو یہ خواہ مخواہ کی ملامت ہوگی،

(۲) دوسری صورت "قصد کردن" کی ہے، یعنی بالقصد ایسے فعل کا ارتکاب کرنا جس سے نفس کے حب جاہ کو صدمہ پہونچے، اور لوگ زبان طعن دراز کریں،

(۳) تیسری صورت "ترک کردن" کی ہے، یعنی قصداً کوئی عمل خلاف شریعت کرنا، یہ طریقہ سراسر نامحمود ہے، اور نتیجہ "کفر و ضلالت طبعی" ہوتا ہے،

آج جو سبز پوش یا سرخ پوش یا زرد پوش یا کسی اور رنگین لباس میں ملبوس اپنے کو

سلسلۂ ملامتیہ میں منسلک بتاتے اور طرح طرح کی خلاف شرع حرکتیں علانیہ کرتے رہتے ہیں، وہ عموماً اسی تیسرے طریقہ "ترک کردن" پر عامل ہیں، اور اپنی ان فاسقانہ بلکہ نیم کافرانہ روش کا نام فقر و تصوف رکھا ہے، شیخؒ نے گویا اسی طبقہ کو پیش نظر رکھ کر الفاظ ذیل لکھے ہیں:-

آنکہ طریقش ترک باشد و خلاف شریعت چیزے بدست گیرد و گوید کہ من طریق ملامت می ورزم آں ضلالت واضح باشد و آفت ظاہر و ہوس صادق، چنانچہ اندریں زمانہ بسیارے ہستند کہ مقصود شان اندر رد خلق قبول ایشاں بود (صفحہ ۴۲)

تو جو کوئی اس طریق ترک کو اختیار کرتا ہے، اور کسی خلاف شریعت عمل کو کر کے کہتا ہے کہ میں اصول ملامتیہ کی پیروی کر رہا ہوں، تو اس کا یہ فعل کھلی ہوئی گمراہی اور روشن معصیت اور تمام نفسانیت ہے، چنانچہ آجکل بہت سے لوگ ایسے پیدا ہوگئے ہیں، جنکا مقصد طریق ملامتیہ کے پردہ میں نمود و نمائش ہے نہ کہ اسکا ترک،

اس کے آگے اپنا ایک ذاتی تجربہ بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ ان کا ایک اسی طرح کے مصنوعی ملامتی کا ساتھ ہو گیا، اُس نے کوئی بد کرداری کی، اور اس سے یہی غرض ظاہر کی کہ ملامت حاصل ہو، ایک رفیق کار نے اس کے اس فعل پر اعتراض کیا، اس پر اُس نے آہ سرد کھینچی، شیخؒ نے کہا اگر ملامتی ہونے کے مدعی ہو اور اپنے اعتقاد میں سچے ہو تو اس رفیق کا ٹوکنا تمھیں گراں کیوں گذرا، تمھیں تو اور خوش ہونا چاہیئے کہ جو مقصود تھا (یعنی ملامت) وہی حاصل ہوا ہے،

شیخؒ کا یہ فقرہ بھی آج کل کے شریعت شکن دعویداران شیخت و کرامت کے لئے بہت قابل غور ہے:-

ہر کہ خلق را دعوت کند بامرے از

جو شخص خلق کے سامنے دعوت حق

حق مرآں را برہانے باید، برہان آں حفظ سنت باشد، چوں از تو ترک فریضہ بینم و تو خلق رابداں دعوت می کنی ایں کار از دائرہ اسلام بیرون می باشد (صفحہ ۴۵)

لیکن اُسے کا مدعی ہوتا ہے، اُسے اپنے دعوے کے ثبوت میں کوئی دلیل بھی لانا چاہیئے اور یہ دلیل سنت رسولؐ کی پابندی ہے، تم دعوت حق کے مدعی ہو، اگر جب تم نے ترک فریضہ کر دیا، تو یہ فعل دائرہ اسلام سے خارج ہے،

(۷) باب ذکر آئمتھم من الصحابۃ (صفحہ ۴۷-۵۱)

اس باب میں خلفاء اربعہ کا ذکر ہے، جو تمام صوفیوں کے سرگروہ و پیشوا ہوئے ہیں، اور اس میں قدرۃً سب سے زیادہ اہمیت حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت علی مرتضیٰؓ کو دی گئی ہے، حضرت صدیقؓ کا تذکرہ ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے:-

"شیخ الاسلام و بعد از انبیاء خیر الانام، خلیفہ و امام، سید اہل تجرید و شاہنشاہ ارباب تفرید از آفات انسانی بعید، امیر المومنین ابوبکر عبداللہ الصدیق کہ وے را کرامات مشہور است و آیات و دلائل ظاہر ...... و مشائخ وے را مقدم ارباب مشاہدت نہند۔"

اور علی مرتضیٰؓ کا ذکر ان الفاظ میں ہے:-

"برادر مصطفےٰ و غریق بحر بلاء و حریق نار ولا مقتدائے جملہ اولیاء و اصفیاء ابوالحسن علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ اور اندریں طریقت شانے و درجہ رفیع بود .....

..... تا حدے کہ جنید گوید رحمۃ اللہ علیہ شیخنا فی الاصول والبلاء علی مرتضیٰ، شیخ ما اندر اصول و اندر بلاکشیدن علی مرتضیٰ است، یعنی امام ما اندر علم طریقت و معاملات آں علی مرتضیٰ است ...... اہل ایں طریقت اقتدا کنند بہ او اندر حقائق عبادات و دقائق اشارات و تجرید از علوم دنیا و آخرت و نظارہ اندر تقدیر حق، و لطائف

کلام وے بیشتر از آن ست کہ بہ عدد اندر آید (صفحہ ۵۱)

تقریباً ایسے ہی شاندار الفاظ میں حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عثمان غنیؓ کے بھی مبارک تذکرے ہیں،

8 (۸) باب فی ذکر ائمتھم من اھل البیت (صفحہ ۵۱-۵۸)

یہ باب خاندان نبوی کے اخلاف صالحین کے کمالات و مناقب پر مشتمل ہے، خصوصاً سیدنا حضرت حسنؓ و سیدنا حضرت حسینؓ، حضرت زین العابدین علی بن حسینؓ، حضرت ابو جعفر محمد باقرؒ، حضرت جعفر صادقؒ کے کمالات و کرامات پر،

9 (۹) باب فی ذکر اھل الصفۃ (صفحہ ۵۸-۶۰)

اصحاب صفہ کے حالات میں شیخ نے اپنی ایک مستقل تصنیف منہاج الدین کا حوالہ دیا ہے، اور اس باب میں صرف ان کے اسمائے گرامی کو شمار کر دیا ہے،

10 (۱۰) باب فی ذکر ائمتھم من التابعین (صفحہ ۶۰-۶۳)

یہ باب اویس قرنی، ہرم بن حیان، حسن بصری اور سعید بن المسیب رحمۃ اللہ علیہم کے تذکروں پر مشتمل ہے، گویا تابعین میں صوفیہ کے سرخیل، پیشوا یہ حضرات ہوئے ہیں، حسن بصریؒ طبقۂ مفسرین میں اور سعید بن المسیب طبقۂ فقہا میں جانے پہچانے ہوئے نام ہیں،

11 (۱۱) باب ذکر ائمتھم فی تبع التابعین (صفحہ ۶۳-۱۱۲)

اس باب کے تحتانی عنوانات ۶۴ ہیں، اور ہر عنوان ایک ایک بزرگ کے تذکرہ کے لئے وقف ہے، امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ، مالک بن دینارؒ، احمد حنبلؒ، حبیب عجمیؒ ذوالنون مصریؒ، داؤد طائیؒ، معروف کرخیؒ، ابراہیم ادھمؒ، سری سقطیؒ، فضیل بن عیاضؒ، جنید بغدادیؒ، ابو بکر شبلیؒ، منصور حلاجؒ، ان چند پر سارے عنوانات کو قیاس کر لیا جائے، گویا طبقۂ تبع تابعین کے اکابر صوفیہ کی فہرست ابو حنیفہ، شافعی

واحمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہم کے اسمائے گرامی سے شروع ہوتی ہے،

12 (۱۲) باب فی ذکر ائمتھم من المتاخرین (صفحہ ۱۱۶-۱۲۳)

متاخرین صوفیہ میں جن دس بزرگوں کے حالات درج کئے ہیں، ان میں شیخ ابوالحسن خرقانیؒ اور امام ابو القاسم قشیریؒ کے نام خاص طور پر قابل لحاظ ہیں،

13 (۱۳) باب فی ذکر الرجال الصوفیۃ من المتاخرین علی الاختصار من اھل البلدان (صفحہ ۱۲۳-۱۲۶)

یہ گویا باب ماقبل کا تکملہ ہے اس میں معاصر صوفیہ کا تذکرہ ہے، اور ان کے طبقات کو ان کی وطنیت کی بنا پر تقسیم کیا ہے، مثلاً صوفیہ شام و عراق، صوفیہ پارس، صوفیہ قہستان، آذربائیجان و طبرستان، صوفیہ کرمان، صوفیہ خراسان، صوفیہ ماوراءالنہر، صوفیہ غزنین۔

14 (۱۴) باب فی فرق فرقھم فی مذاھبھم (صفحہ ۱۲۶-۲۰۰)

کتاب کا سب سے طویل و ضخیم باب یہی ہے جس میں صوفیہ کے مختلف سلسلے اور انکے اصول و باہمی اختلافات کا ذکر ہے۔

اس وقت تک حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے استقصاء میں کل بارہ سلسلے تھے، ان میں سے دس مقبول اور اہل حق تھے، اور باقی دو مردود اور اہل باطل تھے،

دس مقبول سلسلوں کے نام مع ان کے بانیوں کے حسب ذیل ہیں:۔

(۱) محاسبیہ۔	(عبداللہ بن حارث محاسبیؒ)
(۲) قصاریہ۔	(ابو حمدان قصارؒ)
(۳) طیفوریہ۔	(بایزید بسطامیؒ)
(۴) جنیدیہ۔	(جنید بغدادیؒ)
(۵) نوریہ۔	(ابوالحسن نوریؒ)
(۶) سہلیہ۔	(سہل تستریؒ)
(۷) حکیمیہ۔	(حکیم ترمذیؒ)
(۸) خرازیہ۔	(ابو سعید خرازؒ)

(۹) خفیفیہ۔ (ابو عبداللہ خفیفؒ)

(۱۰) سیاریہ (ابو العباس سیاریؒ)

گیارہویں سلسلہ کا نام جو مردود دین اور اہل ضلالت کا ہے، سلسلۂ حلولیہ ہے، اس کا بانی ابو حلمان دمشقی ہوا ہے، بارہویں سلسلہ کا نام کہ وہ بھی مردود ہے درج کتاب نہیں، اس کا انتساب فارس کی جانب کیا جاتا ہے[1]، (صفحہ ۱۹۵)

اس باب میں تصوف کے اکثر مہمات مسائل پر بحث آگئی ہے، گو ضمناً۔ نوعیت مضامین کا اندازہ چند تحتانی ابواب کے عنوانات سے ہوگا حقیقت رضا۔ فرق بین الحال والقال، الکلام فی السکر والصحو، احکام فی حقیقۃ النفس ومعنی الہوی احکام فی مجاہدۃ النفس، الکلام فی حقیقۃ الہوی، الکلام فی اثبات الولایت، الکلام فی اثبات الکرامت، الکلام فی البقاء والفناء الکلام فی الغیبۃ والحضور، الکلام فی الجمع والتفرقہ، تفضیل الانبیاء والاولیاء علی الملائکۃ وقس علی ہذا،

یہاں تک کتاب کا گویا تاریخی اور تنقیدی حصہ تھا، اس کے بعد سے مستقلاً مسائل سلوک کی تشریح شروع ہوتی ہے، اور کشف المحجوب میں حجابات کا کشف ہونے لگتا ہے، شیخ نے حجابات کی تعداد گیارہ قرار دی ہے، اور بعد کے ہر باب میں ایک ایک حجاب کو اٹھایا ہے، ہر باب کئی کئی حصوں میں تقسیم ہے، عنوانات ابواب پر سرسری نظر کافی ہوگی۔

(۱۵) کشف الحجاب الاول فی معرفۃ اللہ صفحہ ۲۰۰ تا صفحہ ۲۰۸

(۱۶) " " الثانی فی التوحید صفحہ ۲۰۸ تا صفحہ ۲۱۵

(۱۷) " " الثالث فی الایمان صفحہ ۲۱۵ تا صفحہ ۲۱۹

(۱۸) " " الرابع فی الطہارۃ صفحہ ۲۱۹ تا صفحہ ۲۲۶، (ایک تحتانی

---

[1] ملا جامی نے پورا نام فارس بن عیسیٰ بغدادی لکھا ہے، منصور حلاج کا مرید بتایا ہے اور بزرگوں میں شمار کیا ہے۔ (صفحہ ۱۴۲، ۱۴۳ نفحات الانس، مطبوعہ کلکتہ)

باب توبہ و متعلقاتِ توبہ پر ہے)

(۱۹) کشف الحجاب الخامس فی الصلوٰۃ صفحہ ۲۲۶ تا صفحہ ۲۳۹، (ایک تحتانی باب محبت و متعلقاتِ محبت پر ہے)

(۲۰) " " السادس فی الزکوٰۃ، صفحہ ۲۳۹ تا صفحہ ۲۴۲، (ایک تحتانی باب جود و سخا پر ہے)

(۲۱) " " السابع فی الصوم صفحہ ۲۴۲ تا صفحہ ۲۵۰ (ایک تحتانی باب بھوک پر ہے)

(۲۲) " " الثامن فی الحج صفحہ ۲۵۰ تا صفحہ ۲۵۷ (ایک تحتانی باب مشاہدہ پر ہے)

(۲۳) " " الحجاب التاسع فی الصحبۃ صفحہ ۲۵۷ تا صفحہ ۲۸۶)

صحبت کو جو مرتبۂ اہمیت سلوک و طریقت میں حاصل ہے، اس کے لحاظ سے یہ بالکل قدرتی ہے کہ یہ باب بسوط و مفصل ہے، آداب و احکامِ صحبت کی تفصیل میں یہ باب بجائے خود دس تحتانی ابواب پر تقسیم ہے، بعض کے عنوانات حسبِ ذیل ہیں:-

باب آدابہم فی الصحبۃ، باب آدابہم فی السفر، باب آدابہم فی الاکل، باب آدابہم فی المشی، باب آدابہم فی الکلام والسکوت، باب آدابہم فی التزویج و التجرید،

(۲۴) کشف الحجاب العاشر فی بیان منطقہم وحدود الفاظہم وحقائق معانیہم (صفحہ ۲۸۶ تا صفحہ ۳۰۶)

اس باب میں پہلے اربابِ سلوک و طریقت کے مصطلحات کا ذکر ہے، ان کے معنی اور ان کے باہمی فرق کی تشریح ہے،

مثلاً حال و وقت، مقام و تمکین، محاضرات و مکاشفات، قبض و بسط، قہر و لطف، انس و ہیبت، نفی و اثبات، علم الیقین، عین الیقین، حق الیقین، علم، معرفت، شریعت و حقیقت، وغیرہ،

مباحث کی نوعیت کا اندازہ اقتباس ذیل سے ہوگا، بیانِ شریعت و حقیقت کے

تعلق باہمی کا ہو رہا ہے،

شریعت فعل بندہ بود و حقیقت
داشت خداوند و حفظ و عصمت
وے، پس اقامت شریعت بے وجود
حقیقت محال باشد و اقامت
حقیقت بے حفظ شریعت ہم محال،
و مثال ایں چوں شخصے باشد زندہ
بر جان و چون جان از وے جدا
شود آں شخص مردارے باشد
و جان چوں بادے کہ قیمت شاں
از مفارقت یک دیگر ست ہمچنیں
شریعت بے حقیقت ریائے بود و
حقیقت بے شریعت نفاق، و خدا
وند گفت " والذین جاھدوا
فینا لنھدینھم سبلنا مجاہدت
شریعت آمد و ہدایت حقیقت آں
یکے حفظ بندہ باشد مر احکام ظاہر
را بر خود و آں دیگر حفظ حق بود مر
احوال باطن را بر بندہ پس شریعت
از مکاسب بود و حقیقت از مواہب
(صفحہ ۳۰)

شریعت بندہ کا فعل ہے اور داشت
خداوندی، حفظ و عصمت الٰہی کا نام
حقیقت ہے، پس شریعت کا تحقق
بلا وجود حقیقت کے محال ہے، ان کے
باہمی تعلق کی مثال روح و جسم کے اتصال
کی ہے، جبتک انسان زندہ ہو دونوں
متصل ہیں، جب روح نکل گئی تو جسم
مردہ ہوگیا، اور روح خود بس اب ہوا
ہوگئی، دونوں کی اہمیت و قدر اسی
وقت تک ہے، جبتک ایک دوسرے کے
شریک رفیق ہیں، اسی طرح شریعت بغیر
سوز حقیقت کے ایک ریاکاری ہو، اور
حقیقت بھی بغیر امتزاج شریعت کے
منافقت ہو، قرآن مجید میں ہے کہ جو
لوگ ہماری راہ میں جد و جہد کرتے رہتے
ہیں انھیں ہم اپنی راہیں دکھا کر رہیں گے،
اس مجاہدہ (جد و جہد) کا نام شریعت
ہے اور جو ہدایت (راہ یابی) اس پر
مرتب ہوتی ہے، اس کا نام حقیقت
ہے، شریعت کا ماحصل احکام ظاہر کی

تعمیل ہے اور حقیقت کا خلاصہ احوال
باطن کا اپنے اوپر طاری کرنا، شریعت
بندہ کے اختیار کی چیز ہے، اور حقیقت
عطیۂ الٰہی ہے،

اس کے بعد مختصر طور پر اور بہت سے مصطلحات صوفیہ، مثلاً حق، حقیقت، ذات صفت وجوہر کے معنی درج کئے ہیں،

(۲۵) کشف المحجاب الحادی عشر فی السماع، صفحہ ۳۰۶ تا صفحہ ۴۲۸

کتاب کا یہ آخری جزو بجائے خود دس بابوں میں تقسیم ہے، باب سماع القرآن، باب سماع الشعر، باب سماع الاصوات والالحان، باب فی احکام السماع، باب اختلافہم فی السماع، باب مراتبہم فی السماع، باب فی الوجد والتواجد، باب فی الرقص، باب فی الخرق، باب فی آداب السماع،

شیخ کے نزدیک سماع کی بہترین صورت سماع آیات قرآنی ہے، فرماتے ہیں۔

" اولیٰ ترین سماع مسموعات مر دل رابہ فوائد سر رابہ زوائد وگوش رابہ لذت کلام خداوند عز اسمہ ست و نامور ند ہمہ مومناں و مکلف اند ہمہ کافراں از آدمی و پری بشنیدن کلام ایزد تعالیٰ (صفحہ ۳۰۷)

سماع قرآن کی افضلیت تو بہرحال کسی مسلمان کے لئے قابل بحث ہے ہی نہیں گفتگو جو کچھ ہے وہ سماع مصطلح یعنی غنا یا شعر کو لحن کے ساتھ سننے میں ہے، شیخ خود صاحب سماع تھے، اور اپنے عمل کی تائید میں آثار صحابہؓ بلکہ عمل رسولؐ تک رکھتے تھے، (صفحہ ۳۱۲ وصفحہ ۳۱۶) چنانچہ ابو عبد الرحمٰن سلمی کی کتاب السماع کا حوالہ دیا ہے، جس میں انھوں نے جواز سماع کی تائید میں احادیث رسولؐ و آثار صحابہؓ کو نقل کیا ہے، (صفحہ ۳۱۶) تاہم فرماتے ہیں کہ

مراد مشایخ متصوفہ از یں طلبیدن | مشایخ صوفیہ کو تلاش اباحت سماع

بجز اباحت ست از انچه اعمال فوائد
باید اباحت طلبیدن کار عوام باشد
در محل مباح ستور انند بندگان مکلف
را باید کہ از کردار فائدہ طلبند

کی نہیں رہتی، اس لئے کہ کسی عمل کو
اس کی اباحت کی بناء پر نہیں، اس
کے فوائد کی بناء پر اختیار کرنا چاہیے،
تلاش اباحت میں صرف عوام رہتے
ہیں، سند جواز چوپایوں کے لئے کافی
ہو سکتی ہے، انسان کے لئے تکلیف شرعی
رکھی گئی ہے، اسے چاہیے کہ کسی عمل
کو اس کے فوائد کی بناء پر اختیار کرے،

اس کے آگے اپنا ایک ذاتی واقعہ بیان کرتے ہیں، جو اس مسئلہ پر بہت سلجھے ہوئے قول فیصل کا حکم رکھتا ہے، اور بہت سے پہلوؤں کا جامع ہے، کہتے ہیں:۔

وقتے من بمرو بودم، یکے از آئمہ اہل
حدیث کہ معروف ترین ایشاں بود مرا گفت
کہ من اندر اباحت سماع کتابے کردہ
ام، گفتم بزرگ مصیبتے کہ اندر دین پدید
آمد کہ خواجہ امام لہوے را کہ اصل ہمہ
فسقہاست حلال کردی مرا گفت پس اگر
حلال نمی دانی، تو چرا می کنی، گفتم حکم
ایں بر وجوہ ست، بر یک چیز قطع نتواں
کرد، اگر تاثیر اندر دل حلال بود سماع
حلال بود و اگر حرام بود حرام و اگر مباح
بود مباح، چیزے را کہ حکم ظاہرش فسق

ایک زمانہ میں میں مرو میں تھا، ایک روز
وہاں کے مشہور ترین امام اہلحدیث نے
مجھ سے کہا کہ میں نے جواز سماع پر ایک
کتاب تصنیف کی ہے میں نے کہا کہ حضرت
یہ تو آپ نے بڑا غضب کیا کہ ایسے لہو کو
حلال کر دیا جو ہر فسق کی جڑ ہے، اس پر
وہ بولے کہ اگر آپ حلال نہیں سمجھتے تو پھر
خود کیوں سنتے ہیں؟ میں نے جواب دیا کہ
اس کا حکم مختلف حالات پر منحصر ہے، کوئی
ایک حکم قطعی طور پر نہیں لگایا جا سکتا، اگر
سماع سے دل میں اثرات بھی حلال قسم

است داندر باطن حالش ردشن بر دجوہ است، اطلاق آں بہ یک چیز محال باشد (صفحہ ۳۱۶)	کے پیدا ہوں تو سماع حلال ہے، اور اگر حرام قسم کے پیدا ہوں تو حرام ہے، اگر مباح پیدا ہوتے ہوں تو مباح ہے، ایسی چیز کہ جس کے ظاہر پہ حکم فسق کا ہو اور جس کا باطن مختلف احوال کا تابع ہے، اس پر کوئی ایک قطعی حکم لگا دینا ممکن نہیں،

کتاب کے آخری جزد کے آخری باب کا عنوان آداب السماع ہے، اور اس پر گویا شیخؒ نے آداب داصول طریقت کا خاتمہ کر دیا ہے، اس میں شیخ نے شرائط سماع حسب ذیل تحریر کئے ہیں :-

(۱) خوامخواہ اور تکلف کر کے سماع نہ سنے، جب تقاضا از خود غالب ہو، اس وقت سُنے۔

(۲) سماع بہت کثرت سے کبھی نہ سُنے کہ طبیعت اس کی خوگر ہو جائے، کبھی کبھی سُنے تاکہ ہیبت سماع دل پر قائم رہے۔

(۳) مرشد یا شیخ طریقت محفل سماع میں موجود رہے،

(۴) محفل میں عوام شریک نہ ہوں۔

(۵) قوال پاکباز ہو، فاسق نہ ہو،

(۶) قلب مکروہات دنیوی سے خالی ہو،

(۷) طبیعت لہو ولعب کی جانب آمادہ نہ ہو،

(۸) تکلف و اہتمام نہ کیا جائے،

تاثیر سماع کے چند موثر واقعات وحکایات درج کرنے کے بعد، اور یہ تسلیم کر کے کہ

سماع بعض صورتوں میں اور بعض موقعوں پر نفسِ انسانی کا بڑا مصلح ہوتا ہے، شیخ اپنے کو یہ تلخ تجربہ بھی قلمبند کرنے پر مجبور پاتے ہیں کہ

اندریں زمانہ گروہے گمشدگان
بر سماع فاسقاں حاضر شوند و
گویند کہ سماع از حق می کنیم و فاسقاں
از آنکہ ایشاں مر ایشاں را اندر آں
موافقت کنند بر سماع کردن و بہ فسق
و فجور حریص تر شوند تا خود ایشاں
ہلاک شوند (صفحہ ۳۲۱)

اس زمانہ میں گمراہوں کا ایک بڑا گروہ پیدا ہو گیا ہے، یہ فاسقوں کی محفل سماع میں شریک ہوتا ہے، اور کہتا ہے کہ ہم سماع حق کے لیے سنتے ہیں، حالانکہ فاسق اس سے فسق و فجور پر اور زیادہ حریص ہو جاتے ہیں، یہاں تک کہ یہ اور وہ دونوں برباد ہو جاتے ہیں،

حالانکہ سماع کی غایت تو یہ ہونی چاہیئے، کہ

فائدہ ایں حکایت آن ست کہ
مرید را اندر غلبۂ سماع حال چنیں
بباید کہ سماع وے فاسقاں را از فسق
نجات دہد، صفحہ ۳۲۱

مرید کو سماع میں ایسی کیفیت پیدا ہو جائے، جس سے دوسرے فاسق فسق سے نجات پا جائیں،

شیخ تمامتر منکرین سماع میں نہیں، جب ان کا معیار یہ تھا، تو انہی کے معیار سے آج نو سو سال کے بعد جب فضا کہیں بڑھ کر فاسقانہ اور ماحول کہیں بڑھ کر طاغیانہ ہو چکا ہے، آج کی قوالی کی محفلیں، جن میں شریک ہونے والے خواص سے کہیں زیادہ عوام ہوتے ہیں، اور پیشہ ور قوال تو گویا تمامتر ہی فسق پیشہ ہوتے ہیں، اور ستار اور ہارمونیم اور طرح طرح کے باجوں کا رواج عام طور سے ہو چکا ہے، کس حکم میں داخل ہوں گی؟

(۳) رسالۃ القشیریہ[1]

(امام ابوالقاسم قشیریؒ)

(الف) مصنّف

تذکروں میں حالات بہت ہی مختصر ملے، اسم گرامی ابوالقاسم عبدالکریم بن ہوازن القشیری تھا، لقب زین الاسلام، مولد خراسان، مدفن نیشاپور،

تاریخ ولادت بہ قول شیخ الاسلام زکریا انصاری شارح رسالہ ربیع الاول ۳۷۶ھ ہے، تاریخ وفات ۱۶ ربیع الثانی ۴۶۵ھ ہے، اور اس میں کوئی اختلاف نہیں، عمر اس حساب سے ۸۹ سال کی ہوتی ہے،

ابھی بچہ تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا، ابتدائی تعلیم ابوالقاسم یمانی سے حاصل کی، یہ عربی زبان و ادب کے نامور استاد تھے، خدارسی کے شوق میں شیخ وقت ابوعلی دقاق کی خدمت میں حاضر ہوئے، ارشاد ہوا کہ پہلے علوم دینی میں کمال حاصل کرو، حکم کی تعمیل میں تفسیر، حدیث، کلام، اصول، فقہ، نحو، شعر، وغیرہ، علوم متداول میں

---

[1] ماخذ:- (۱) تذکرۃ الاولیاء عطار جلد اوّل
(۲) مدینۃ العلوم ازنیقی (نسخہ قلمی)
(۳) سفینۃ الاولیاء، داراشکوہ (لکھنؤ)
(۴) بستان المحدثین شاہ عبدالعزیز دہلوی (لاہور)
(۵) نفحات الانس جامی (کلکتہ)
(۶) رسالۃ القشیریہ (مصر) سرورق
(۷) تاریخ بغداد خطیب بغدادی، (۱۲ مجلدات (مصر)

مہارت حاصل کی، جن استادوں سے استفادہ کیا، وہ اپنے وقت کے ماہرین فن تھے، مثلاً ابو الحسن بن بشر وتی، ابو نعیم اسفرائینی، ابو بکر طوسی، ابو بکر فورک، ابو اسحٰق اسفرائینی وغیرہم،

علوم ظاہری سے فراغت کے بعد ابو علی دقاق کی خانقاہ تصوف و فقر میں قدم رکھا، اور ان ہی کی صاحبزادی سے عقد بھی کیا[1]

ان کی وفات کے بعد شیخ ابو عبد الرحمٰن سلمی (صاحب طبقات الصوفیہ) سے مستفید ہوتے رہے، بیعت شیخ دقاقؒ ہی سے تھی، رسالہ میں ان کا ذکر خاص عقیدت کے ساتھ کیا ہے، اور ان کے نام کے ساتھ لقب استاد کا اضافہ کرتے گئے ہیں،

تصانیف متعدد چھوڑیں، مختلف فنون پر اور فاضلانہ، شیخ ہجویریؒ باوجود معاصرت فرماتے ہیں:۔

"اندر ہر فن او را لطائف بسیار است و تصانیف نفیس جملہ با تحقیق" (کشف المحجوب صـ۱۳۱)

شاہ عبد العزیز دہلویؒ نے تصانیف ذیل کی تصریح کی ہے،

(۱) رسالۃ القشیریہ (۲) نحو القلوب،

(۳) ایک عظیم الشان تفسیر القرآن[2] (۴) لطائف الاشارات

(۵) کتاب الجواہر (۶) کتاب احکام السماع

---

[1] یہیں سے ہمارے زمانہ کے جاہل مشائخ اور پیر زادوں کے اس خیال کی بھی تردید ہو رہی ہے کہ شیخ کی لڑکی سے نکاح کرنا سوء ادب میں داخل ہے،

[2] "تفسیرے ست نہایت کلاں و آں بہترین تفاسیر است۔" (بستان المحدثین)

"ھو من اجل التفاسیر و اوضحھا۔" (مدینۃ العلوم)

علمائے عصر میں ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ (نظام القرآن) کی زبان سے بھی ایسی ہی تعریف سننے میں آئی ہے۔

(۷) کتاب آداب صوفیہ (۸) کتاب عیون الاجوبۃ

(۹) کتاب المناجات (۱۰) کتاب المنتہیٰ،

مدینۃ العلوم میں جو فہرست تصانیف دی ہے، وہ اس سے کسی قدر مختلف ہے، عبادت میں شغف و اہتمام کا اندازہ اس سے ہوگا کہ مرض الموت میں نفلیں تک نہ چھوٹنے پائیں، اور نمازیں برابر کھڑے ہو کر ادا کرتے رہے،

سالک و طریقت میں جو پایہ رکھتے ہیں، اس کا حال معاصر بزرگ شیخ ہجویری کی زبان سے سنئے:۔

استاد امام و زین الاسلام ابو القاسم	استاد امام زین الاسلام ابو القاسم
عبد الکریم بن ہوازن القشیریہ اندر	عبد الکریم بن ہوازن القشیری اپنے
زمانۂ خود بدیع بود و قدرش رفیع	زمانہ میں فرد تھے اور بڑے بلند پایہ،
و منزلتش بزرگ و معلوم است اہل	ان کی عظمت اور ان کا علم و فضل
زمانہ را روزگار وے و انواع فضلش	سب کو معلوم و مسلم ہے، ہر فن میں
و اندر ہر فن ازو لطائف بسیار	ان کی کتابیں اور ان کے رسائل موجود
است، و تصانیف نفیس جملہ باتحقیق	ہیں اور ان کی جملہ تصانیف اعلیٰ و
و خداوند تعالیٰ حال و زبان وے	باتحقیق ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کے
را از حشو محفوظ گردانیدہ بود،	حال اور زبان کو لغو سے پاک
(کشف المحجوب صد ۱۳۱)	کر دیا تھا،

مدینۃ العلوم کی عبارت ذیل سے معلوم ہوتا ہے، کہ فاضل، ہمہ داں اور مختلف علوم و فنون کے جامع تھے:۔

کان جامعاً بین اشتات العلوم، کان فقیہاً اصولیاً محققاً محدثاً حافظاً متقناً نحویاً لغویاً کاتباً شاعراً،

منصور حلاج کے حال سے متعلق خود صوفیہ کے گروہ کے اندر تردد و تذبذب اور اختلاف رائے ہے، امام قشیری ہی کا مقولہ ذیل ان کے باب میں قول فیصل سمجھا گیا ہے:-

چنانکہ استاد ابو القاسم قشیری گفت درحق او کہ اگر مقبول بود بہ رد خلق مردود نہ گردد و اگر مردود بود بہ قبول خلق مقبول نہ گردد۔ (تذکرۃ اولیا عطار - جلد ۲ صفحہ ۱۴۵)	اگر وہ مقبول تھے، تو خلق کے انکار سے مردود نہ ہو جائیں گے اور اگر مردود تھے تو خلق کے قبول سے مقبول نہ ہو جائیں گے،

شیخ ابو الحسن خرقانی کی عظمت سے قلب بہت زیادہ متاثر تھا صاحب کشف المحجوب براہ راست روایت کرتے ہیں کہ

از استاد ابو القاسم قشیری شنیدم کہ چوں من بہ ولایت خرقان اندر آمدم، فصاحتم برسید و عبارتم نماند از حشمت آں پیر و پنداشتم کہ از ولایت خود معزول شدم (صفحہ ۱۱۰)	استاد ابو القاسم قشیری مجھ سے فرماتے تھے کہ جب میں علاقہ خرقان میں پہنچا تو اس بزرگ کی ہیبت ایسی طاری ہوئی کہ گویائی جاتی رہی اور تاب گفتگو نہ رہی، اور خیال یہ پیدا ہوا کہ ولایت سے معزول کر دیا گیا ہوں،

یہ قول شیخ فرید الدین عطار نے بھی نقل کیا ہے۔ "تذکرۃ الاولیا جلد ۲، صفحہ ۳۰۷"

بغداد اس وقت عروس البلاد تھا، ۴۴۸ھ میں اپنی عمر کے ۶۲ سال میں وہاں آئے، رسالہ اس سے ۱۱ سال قبل ۴۳۷ھ میں تصنیف کر چکے تھے، بغداد آ کر حدیثوں کی روایت کی، معاصر مورخ خطیب بغدادی کی روایت ہے،

قدم علینا فی سنۃ ثمان واربعین واربع مائۃ وحدث ببغداد و کتبنا عنہ (تاریخ بغداد جلد ۱۱ صفحہ ۸۳)

عقائد میں اشعری اور فقہ میں شافعی تھے، ثقہ اور واعظ خوش بیان ہونے کی شہادت بھی اسی معاصر مورخ کی زبان سے موجود ہے،

کان ثقۃ وکان یقص وکان حسن الموعظۃ ومليح الاشارۃ وکان یعرف الاصول علی مذھب الاشعری والفروع علی مذھب الشافعی (ایضاً)

صاحب کشف المحجوب نے قشیری کے متعدد اقوال اپنے ہاں نقل کئے ہیں، ان میں سے دو نمونہ کے طور پر حاضر ہیں:-

(۱) مردان اندر فقر و غنا سخن گفتہ اند وخود را اختیار ے کردہ و من آں اختیار کنم کہ حق مرا اختیار کند، مرا اندر آں نگاہ دارد، اگر تونگر دارد م غافل نباشم واگر درویش خواہدم حریص و معترض نباشم (صفحہ ۱۷)	لوگوں کے اقوال فقر و تونگری کے باب میں مختلف ہیں، کسی نے ایک کو اپنے لئے اختیار کیا ہے کسی نے دوسرے کو، لیکن میں اسی شے کو اختیار کئے ہوئے ہوں جو اللہ میرے لئے اختیار کر دے اور جس میں مجھے رکھے، اور اگر تونگر بنا کر رکھے تو غافل نہ ہوں گا اور اگر فقیر بنا کر رکھے تو حریص و دراز دست نہ رہوں گا،
(۲) مثل الصوفی کعلۃ البرسام اولہ ھذیان وآخرہ سکوت فاذا تمکنت خرست	صوفی کی مثال مرض برسام کی سی ہے جس کی ابتدا میں ہذیان ہوتا ہے اور آخر میں سکوت یعنی جب تم کمال کو پہنچ جاتے ہو تو زبان گنگ ہو جاتی ہے،

شیخ عطارؒ کی روایت ہے کہ قشیریؒ سماع کے قائل نہ تھے، "در نقل است کہ استاد ابو القاسم سماع را معتقد نہ بود۔" (جلد ۲ صفحہ ۲۳۲) لیکن خود رسالہ میں انکار صریح

نہیں پایا جاتا،

عطار ہی نے یہ بھی لکھا ہے کہ استاد ابو القاسم سماع کے منکر تھے، ایک روز شیخ ابو سعید کے سامنے سے گذرے وہاں محفل سماع گرم تھی، استاد نے اپنے دل میں کہا ہے کہ جو لوگ یوں برہنہ سر، برہنہ پا مارے مارے پھرتے ہیں، شریعت میں انکا ثقہ ہونا مستند نہیں، اور ان کی گواہی کا اعتبار نہیں، شیخ نے اُسی وقت ایک شخص کو دوڑایا کہ استاد سے ذرا پوچھو کہ ہم کب بہ حیثیت گواہ حاضر ہوئے تھے جو ہماری گواہی کے معتبر ہونے نہ ہونے کا سوال پیدا ہوا؟

بڑوں کی بعض باتیں بڑے ہی سمجھ سکتے ہیں، عطارؔ نے ایک طویل حکایت اور درج کی ہے، (جلد ۲ صفحہ ۳۳۱ و ۳۳۳) اس کا صرف خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے؛ روایت کی ذمہ داری حضرت عطارؔ پر ہے،

جس صبح کو شیخ ابو سعید ابو الخیر نیشاپور وارد ہونے والے ہیں، اسی شب میں خود استاد قشیری اور ان کے تیس مریدوں نے خواب میں دیکھا کہ آفتاب زمین پر اتر آیا ہے، صبح کو شیخ کے ورود کا غلغلہ ہوا، استاد نے اپنے حلقہ نشینوں کو شیخ کے پاس حاضر ہونے سے منع کر دیا۔ لیکن جن شاگردوں نے خواب دیکھا تھا سب حاضر خدمت ہوئے، استاد کو اس سے ملال ہوا اور وہ خود شیخ سے ملنے نہ آئے، ایک روز سر منبر استاد نے فرمایا کہ "مجھ میں اور ابو سعید میں یہ فرق ہے کہ ابو سعید خدا کو چاہتے ہیں اور خدا مجھ کو، پس ان کے اور میرے وہ نسبت ہے جو ذرہ کو کوہ سے ہوتی ہے" کسی نے یہ مقولہ شیخ سے نقل کر دیا، شیخ نے فرمایا کہ "میں تو کچھ بھی نہیں ہوں، ذرہ اور کوہ سب وہی ہیں" استاد نے یہ خبر سنی تو اور زیادہ اشتعال پیدا ہوا، اور سر منبر کہہ دیا کہ جو شخص ابو سعید کی مجلس میں جائے گا وہ بد نصیب یا مردود ہے، اسی شب میں خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی کہ جیسے حضورؐ کہیں

تشریف لئے جارہے ہیں، عرض کی کہ قصد مبارک کہاں کا ہے؟ ارشاد ہوا کہ "مجلس ابوسعیدؒ کا، کہ جو شخص وہاں حاضر نہ ہوگا وہ بدنصیب یا مردود ہے" استادؒ گھبرا کر بیدار ہوئے اور وضو کرکے شیخ کی مجلس میں حاضر ہوئے، یہاں پہونچ کر شیخ کی ظاہری شان وشوکت دیکھی تو پھر ایک بار بدگمانی پیدا ہوئی، اور دل میں خطرہ گذرا کہ شیخ علم وفضل میں مجھ سے زائد نہیں، مرتبۂ روحانی میں ہم پلہ ہیں، پھر انھیں یہ اعزاز واکرام کہاں سے حاصل ہوا؟ شیخؒ پر استادؒ کے اس خطرہ کا کشف ہوگیا، رات کے واقعات کا پتہ دینا شروع کیا۔ اب استاد کے شبہات دور ہوگئے اور طبیعت بالکل صاف ہوگئی۔ شیخ جب منبر سے اترے، تو دونوں صاحب بغلگیر ہوئے، استادؒ اپنے خیالات سے تائب ہوئے، ربط باہمی اتنا بڑھا کہ ایک روز اپنے پہلے قول کی تردید کلی بھی برسر منبر فرمایا کہ جو شخص ابوسعیدؒ کی مجلس میں حاضر نہ ہو وہ محجوب یا مطرود ہے" واللہ اعلم بحقیقۃ الحال،

(ب) تصنیف

کتاب کا پورا نام رسالۃ القشیریہ فی علم التصوف ہے، متاخرین نے اکثر صرف الرسالہ کے نام سے ذکر کیا ہے، سال تصنیف کی تصریح خود دیباچہ میں موجود ہے، سنہ ۴۳۷ھ گویا شیخ ہجویری کی فارسی کشف المحجوب سے چند سال قبل تصوف کے موجودہ قدیم ذخیرہ میں شہرت واستناد کا جو مرتبہ امتیاز اس رسالہ کو حاصل ہے کمتر کسی کے نصیب میں آیا ہے، کتاب اللمع کا پتا لگنے سے قبل اسی کو تصوف کی قدیم ترین کتاب سمجھا جاتا تھا۔

الرسالہ کی مخاطب ممالک اسلامی کی معاصر جماعت صوفیہ ہے،

کتبتہا الفقیر الی اللہ تعالیٰ عبدالکریم　　اس رسالہ کو فقیر عبدالکریم بن ہوازن

ابن ھوازن القشیری الی جماعۃ	قشیری نے اسلامی ممالک کی جماعت
الصوفیۃ ببلدان الاسلام (۴۳۷ھ)	صوفیہ کے نام لکھا ہے۔

ارکان جماعت کے نام گویا یہ ایک کھلا خط ہے، جس میں مخاطبین سے جابجا خطاب صیغہ جمع حاضر میں ہے، سبب تالیف یہ بیان کیا ہے کہ صوفیہ متقدمین دنیا سے رخصت ہو چکے، ان کے طور طریقے بھی ان کے ساتھ ناپید ہو گئے، اب بجائے ان کے جو لوگ ہیں، اور ان کی نیابت کے مدعی ہیں وہ عبادات کے تارک ہیں اور غفلتوں اور خواہشوں میں مبتلا،

اعلموا ان المحققین من ھذہ	اس طبقہ کے جو محققین تھے ان میں
الطائفۃ انقرض اکثرھم ولم	سے اکثر اٹھ گئے، اور ہمارے زمانہ
یبق فی زماننا ھذا من ھذہ	میں ان لوگوں کی بس یاد ہی باقی
الطائفۃ الا اثرھم حصلت	رہ گئی، اصل طریقہ گویا مفقود ہی
الفترۃ فی ھذہ الطریقۃ	ہو گیا ہے، اور حقیقت کے
لا بل اندرست الطریقۃ	میدان میں سناٹا چھا گیا ہے، نہ
بالحقیقۃ مضی الشیوخ الذین	وہ بزرگ باقی رہے جن کی راہ پر
کان بھم اھتداء وقل الشباب	چلا جائے، اور نہ وہ جوان جن کی
الذین کان لھم بسیرھم وسنتھم	سیرت اختیار کی جائے، زہد و
اقتداءً وزال الورع وطوی	تقوی کی بساط ہی الٹ گئی اور
بساطہ واشتد الطمع وقوی	حرص و طمع کا دور دورہ آ گیا،
رباطہ وارتحل عن القلوب حرمۃ	شریعت کا احترام تک دلوں سے
الشریعۃ فعدوا قلۃ المبالاۃ	مٹ گیا اور دین کی طرف سے
بالدین اوثق ذریعۃ ورفضوا التمییز	بے پروائی اور آسان ہو گئی، احکام

بين الحلال والحرام ودانوا
بترك الاحترام وطرح الاحتشام
واستخفوا باداء العبادات واستهانوا
بالصوم والصلوٰة وركضوا في
ميدان الغفلات وركنوا الى
اتباع الشهوات (ص ۲ و ۳)

کی عظمت نہ رہی، اور عبادات، نماز
روزہ کی بے وقعتی دلوں میں سما گئی اور
غفلتوں اور شہوتوں کی طرف رجحان
عام ہو گیا،

جب ان نام نہاد صوفیہ کی اخلاقی پستی حد سے گذر گئی، عبادت وطاعت میں انہماک کے بجائے ان سے استخفاف شروع ہو گیا، شریعت کی پیروی کی جگہ اسکی خلاف ورزی باعث فخر سمجھی جانے لگی، روح کے تزکیہ سے کوئی واسطہ نہ رہا، سرتاسر نفسانیت غالب آگئی اور ستم یہ کہ ان دنیاداریوں کے باوجود دعوٰی شیخیت و روحانیت کا قائم رہا، اور مخالفین کو حقیقت تصوف سے انکار اور منکرین کو مسلک حقیقت پر اعتراض کے موقعے کثرت سے ملنے لگے، تو ایسی حالت میں شیخ کو ضروری معلوم ہوا کہ جماعت کی خدمت میں ایسا رسالہ پیش کیا جائے، جس میں صوفیہ متقدمین کے صحیح حالات کا بیان اور ان کے اخلاق وعبادات، عقائد و معمولات وغیرہ کی تفصیل ہو،

فعلقت هذه الرسالة
اليكم اكرمكم الله ذكرت
فيها بعض سير شيوخ هذه
الطريقة في آدابهم واخلاقهم
ومعاملاتهم وعقائدهم
بقلوبهم وما اشاروا اليه من

ان حالات میں میں نے یہ رسالہ آپ
لوگوں کی خدمت میں لکھا ہے اس میں
میں نے شیوخ طریقت کی سیرتوں
کا ذکر کیا ہے، جن سے انکے آداب،
اخلاق، معاملات وعقائد پر روشنی
پڑے گی، اور ان کے وجد و حال اور

مواجیدھم وکیفیۃ ترقیھم من مدایتھم الی نہایتھم لتکون لمریدی ھذہ الطریقۃ قوۃ (صہ)	ان کی کیفیات ترقی کی جانب اشارے ہیں، تاکہ ان کے مطالعے طریقت کے طالبین و سالکین کو قوت حاصل ہو۔

بنے ہوئے صوفیوں اور گڑھے ہوئے تصوف کا یہ نقشہ جب پانچویں ہی صدی ہجری کے شروع میں ہو گیا تھا، تو پھر آج کے "شاہ صاحبوں" کی مصوری کن لفظوں اور عبارتوں سے کی جائے۔

الرسالہ مصری چھپا ہوا چوڑی تقطیع اور باریک ٹائپ کے ۱۸۶ صفحوں پر آیا ہے،

ابتداء کے چند صفحات (صہ ۳-۷) اعتقاد ھذہ الطائفۃ فی مسائل الاصول پر ہیں اور ان میں اصول توحید و مسائل توحید میں قدمائے صوفیہ کے اقوال درج ہیں،

باب (۱) کا عنوان فی ذکر مشائخ ھذہ الطریقۃ وما یدل من سیرھم واقوالھم علی تعظیم الشریعۃ ہے (صہ ۷-۲۱)

اس میں اسّی سے کچھ اوپر بزرگوں کا تذکرہ ہے، جن میں سے ہر ایک اپنے ملک اور زمانہ میں کامل اور مسلم صوفی ہوا ہے، مثلاً ابراہیم ادھم، فضیل عیاض، ذوالنون مصری، معروف کرخی، سہل تستری، سری سقطی، بایزید بسطامی، یحییٰ معاذ رازی، شفیق بلخی، جنید بغدادی، وغیرہم، اور ان کے اقوال اور اعمال و وقائع سے یہ دکھایا ہے کہ شریعت کا کتنا اہم درجہ ان حضرات کی نظر میں تھا،

سب سے پہلے لفظ تصوف و تاریخ تصوف کا بیان چند لفظوں میں ہے،

ان المسلمین بعد رسول اللہ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ

صلی اللہ علیہ وسلم لم یتسم
افاضلهم فی عصرهم بتسمیة
علم سوی صحبة رسول الله
صلی الله علیه وسلم اذ لا فضیلة
فوقها فقیل لهم الصحابة
ولما ادرک اهل العصر الثانی
سمی من صحب الصحابة التابعین
ورأوا ذالک اشرف سمة
ثم قیل لمن بعدهم اتباع
التابعین ثم اختلف الناس
وتباینت المراتب فقیل
لخواص الناس ممن لهم شدة
عنایة بامر الدین الزهاد
والعباد ثم ظهرت البدع
وحصل التداعی بین الفرق
فکل فریق ادعوا ان فیهم
زهادا فانفرد خواص اهل
السنة المراعون انفاسهم
مع الله تعالی الحافظون
قلوبهم عن طوارق الغفلة
باسم التصوف واشتهر هذا

کے لئے مومن کے لئے کوئی لفظ صحابی
سے بڑھ کر پر فخر اور افضل نہیں ہو سکتا
تھا۔ چنانچہ اس وقت کے افاضل
اسی لقب سے موسوم ہوئے، اسکے
بعد جب دوسری نسل چلی تو ان
صحابیوں کے صحابیوں کے لئے تابعین
کی اصطلاح ہوئی پھر ان کی بھی
آنکھیں دیکھنے والے تبع تابعین
کہلائے، اس کے بعد جب امت
زیادہ پھیلی اور لوگ طرح طرح کے
پیدا ہونے لگے تو جن لوگوں کو امور
دین میں زیادہ انہماک ہوا
انھیں زہاد و عباد کہا جانے لگا
لیکن جب بدعتوں کا ظہور ہوا اور
فرقہ فرقہ الگ ہو گئے تو ہر فرقہ اس
کا مدعی بن بیٹھا کہ زہاد و عباد اسی
میں ہیں، اس وقت اہل سنت کے
طبقۂ خاص نے جو ذکر الٰہی میں مشغول
اور غفلتوں سے دور رہتا تھا، اپنے
لئے "اہل تصوف" کی اصطلاح قائم
کی اور ہجرت کو ابھی دو صدیاں پوری

نہیں ہوئی تھیں کہ یہ لقب اس طبقہ خواص کے اکابر کے لئے مخصوص ہوگیا'

الاسم لخواص الاکابر قبل المائتین من الھجرۃ (ص۸)

اس کے بعد اکابر طریقت کی حکایتیں، اور اقوال نقل کئے ہیں، جن سے معلوم ہوگا کہ اُن حضرات کے نزدیک تصوف کیا چیز تھی، اور اب اس سے موجودہ گدی نشینوں کی رسوم پرستی کو کچھ علاقہ رہ گیا ہے۔

بشر حافی جس پایہ کے امام طریقت گذرے ہیں، سب کو معلوم ہے، ان کی بابت یہ واقعہ انہی کی زبانی درج ہے،

میں نے خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی، ارشاد ہوا اے بشر تمکو معلوم ہے کہ اللہ نے تمھارے معاصرین میں سے تمھاری اتنی عزت افزائی کیوں کی؟ عرض کیا کہ نہیں معلوم، ارشاد ہوا کہ میری سنت کی پیروی، صالحین کی خدمت گزاری' اپنے بھائیوں کی خیر اندیشی اور میرے اصحاب و اہل بیت کے ساتھ محبت کی بنا پر، بس یہی چیزیں ہیں جنھوں نے تجھے ابرار کے مرتبہ پر فائز کردیا،

رأیت النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی المنام فقال لی یا بشر تدری لم رفعک اللہ من بین اقرانک قلت لا یا رسول اللہ قال باتباعک لسنتی وخدمتک للصالحین ونصیحتک لاخوانک ومحبتک لاصحابی واھل بیتی ھو الذی بلغک منازل الابرار (ص۱۱)

بایزید بسطامی سے دریافت کیا گیا کہ آپ اس مرتبہ تک کیونکر پہونچے؟ بولے "بھوکے پیٹ اور ننگے بدن کے ذریعہ سے"۔ انہی بایزید کو شورش و سرمستی کے باوجود اتباع سنت میں اس قدر انہماک تھا کہ خود فرماتے ہیں کہ ایک بار میں نے اللہ سے

دعا کرنی چاہی کہ میرے لئے کھانے کی خواہش اور عورت کی خواہش کو مردہ کر دے معاً یہ خیال آگیا کہ جس شے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لئے نہیں کیا، میں اسے کیونکر طلب کر دل، اور اس دعا سے باز رہا، اس احترام سنت نبوی کا صلہ یہ ملا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے از خود خواہش نساء کو میرے لئے اس قدر مردہ کر دیا کہ میرے نزدیک دیوار اور عورت برابر ہیں، (صـ۱۲)

حاتم اصم فرماتے ہیں کہ صبح شیطان مجھ سے سوال کرتا ہے کہ تیرا کھانا کیا ہے، لباس کیا ہے، اور سکونت کہاں ہے؟ میں جواب دیتا ہوں کہ میری غذا موت ہے، میرا لباس کفن ہے اور میرا مسکن قبر ہے، انہی بزرگ سے لوگوں نے پوچھا کہ آپ کو خواہشات نہیں پیدا ہوتیں؟ جواب دیا کہ میری سب سے بڑی خواہش یہ رہتی ہے کہ رات ہونے تک دن خیریت سے گذر جائے، لوگوں نے کہا کہ دن تو خیریت سے گذرتے ہی رہتے ہیں، ارشاد ہوا کہ میں خیریت اسے کہتا ہوں کہ اس روز معاصی الٰہی کا ارتکاب نہ ہو (صـ۱۶)

شیخ ابو الحسن احمد دارامیؒ سے منقول ہے کہ اتباع سنت نبوی سے باہر ہو کر کوئی سا بھی عمل کیا جائے باطل ہو گا، (صـ۱۷)

جنید بغدادیؒ سید الطائفہ کہلاتے ہیں، ان کے اقوالِ ذیل آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں:۔

"ہم نے تصوف کو قیل و قال کے ذریعہ سے حاصل نہیں کیا ہے، بلکہ گرسنگی ترک دنیا اور ترک مرغوبات و مالوفات سے حاصل کیا ہے،

"خلق پر تمام راستے بند کر دیئے گئے ہیں، بجز اس کے کہ سنت نبوی کے نقش قدم پر چلا جائے۔"

"ہمارا سارا طریقہ کتاب اللہ و سنت رسول کا پابند ہے"

"جو شخص کلام الٰہی کا حافظ اور احادیث رسول کا عالم نہیں اس کی تقلید طریقت کے باب میں درست نہیں، اس لئے کہ ہمارے اس سارے علم (سلوک) کا ماخذ قرآن و حدیث ہیں۔" (۱۹)

شیخ داؤد رقی کا قول تھا کہ دنیا میں سب سے کمزور شخص وہ ہے جو اپنی خواہشوں کے ضبط پر قدرت نہ رکھتا ہو، اور سب سے زیادہ طاقتور وہ ہے، جو اس پر قدرت رکھتا ہو، اور اللہ سے محبت رکھنے کی علامت یہ ہے کہ اس کی طاعتوں کو اختیار کیا جائے، اور اس کے رسول کی راہ پر چلا جائے، (صفحہ ۲۵)

غرض اسی طرح باب میں جتنی حکایات اور اقوال نقل کیے ہیں، ان کا حاصل صرف یہ چند چیزیں ہیں: تعظیم شریعت، علم قرآن و حدیث، اتباع سنت نبوی، ترک لذات، قطع علائق، لزوم عبادات و مجاہدات،

باب (۲) کا عنوان ہے، فی تفسیر الفاظ تدور بین ھذہ الطائفۃ وبیان مایشکل منھا۔ (صفحہ ۲۱-۴۵)

اس میں مصطلحات تصوف کی توضیح و تشریح ہے، مثلاً وقت، مقام، حال، قبض، بسط، ہیبت، انس، تواجد، وجد، وجود، جمع، فرق، فنا، بقا، غیبت، حضور، صحو و سکر وغیرہا،

محو و اثبات دو ایک تعریفوں کے نمونے ملاحظہ ہوں:۔

المحو رفع اوصاف العادۃ	محو نام ہے صفات عادی کے ادا
والاثبات اقامۃ احکام	ہوجانے کا اور اثبات نام ہے احکام
العبادۃ فمن نفی عن احوالہ	عبادت کے قائم ہوجانے کا، پس جس
الخصال الذمیمۃ واتی	نے اپنے احوال سے صفات بد کو دور
بدلھا بالافعال والاحوال	کردیا اور انکے بجائے افعال و احوال

الحيرة فهو صاحب محو واثبات (ص۳۹)

حیرہ پر قائم ہو گیا وہ صاحب محو اثبات ہے۔

تلوین و تمکین

التلوين صفة ارباب الاحوال والتمكين صفة اهل الحقائق فمادام العبد في الطريق فهو صاحب تلوين لانه يرتقي من حال الى حال وينتقل من وصف الى وصف ويخرج من مرحل ويحصل في مربع فاذا وصل تمكن (ص۱۲۱)

تلوین اہل حال کی صفت ہے اور تمکین اہل حقیقت کی، بندہ جب تک اثنائے راہ میں ہے برابر ایک حال سے دوسرے حال میں ترقی اور ایک وصف سے دوسرے وصف کی طرف منتقل ہوتا رہتا ہے اور اس لئے صاحب تلوین کہلاتا ہے، پھر جب راہ سے نکل کر منزل وصف تک پہنچ جاتا ہے تو اسے تمکین حاصل ہو جاتی ہے۔

شریعت و حقیقت

الشريعة امر بالتزام العبودية والحقيقة مشاهدة الربوبية فكل شريعة غير مؤيدة بالحقيقة فغير مقبول وكل حقيقة غير مقيدة بالشريعة فغير محصول، (ص۴۳)

شریعت نام ہے التزام حکم عبودیت کا، اور حقیقت نام ہے مشاہدہ ربوبیت کا پس جس شریعت کو حقیقت کی تائید حاصل نہ ہو وہ غیر مقبول ہے، اور جو حقیقت شریعت کی پابند نہیں وہ لاحاصل ہے،

اس کے بعد احوال، مقامات و مسائل تصوف سے متعلق جتنے اہم عنوانات ہو سکتے ہیں، سب پر الگ الگ ایک باب باندھا ہے، اور اس پر قرآن مجید، احادیث رسول، اور اقوال اکابر سلف کی روشنی میں گفتگو کی ہے، ان بابوں کی تعداد پچاس ہے۔ (ص ۴۹-۱۹۷)

چند عنوانات ملاحظہ ہوں:-

باب التوبۃ ، باب المجاھدۃ ، باب الحزن ، باب الجوع وترک الشہوۃ

باب مخالفۃ النفس ، باب الحسد ، باب القناعۃ ، باب الذکر ، باب الجود والسخا ،

باب الغیرۃ ، باب الصحبۃ ، باب السماع ،

یہ تمام باب ، اختصار کے باوجود جامعیت کا وصف رکھتے ہیں ، ان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اکثر کا آغاز قرآن مجید ہی کی کسی آیت سے ہوتا ہے ، اور یہ گویا ایک عملی دلیل ہے ، مصنف کے اس دعوی کی ، کہ سلوک کا اصل ماخذ قرآن مجید ہے چند ابواب کی افتتاحی آیتیں ملاحظہ ہوں ،

باب الحزن ۔ قال اللہ عزوجل وقال الحمد للہ الذی اذھب عنا الحزن ،

باب التقوی ۔ قال اللہ تعالیٰ ، ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم ،

باب الیقین ۔ قال اللہ تعالیٰ ، والذین یومنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک وبالآخرۃ ھم یوقنون

باب الصبر ۔ قال اللہ تعالیٰ ، واصبر وما صبرک الا باللہ ،

باب الفتوہ ۔ قال اللہ تعالیٰ ، انھم فتیۃ آمنوا بربھم وزدناھم ھدی

باب الحیاء ۔ قال اللہ تعالیٰ ، الم یعلم بان اللہ یری ،

ان عنوانی آیتوں سے یہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ شیخ کو قرآن مجید سے استنباط نکات میں ملکہ حاصل تھا ، آیات قرآنی کے بعد احادیث نبوی کو رکھا ہے ، اور جس باب سے متعلق کوئی صریح و واضح آیت قرآنی نہ مل سکی ، اُسے حدیث سے شروع کیا ہے ، اور یوں عملاً بھی ظاہر کر دیا ، کہ تصوف اسلامی کے ماخذوں میں قرآن مجید کے بعد دوسرا درجہ حدیث رسول کا ہے ،

کتاب کا باب (۵۱) ، باب السماع پر ختم ہو جاتا ہے ،

باب (۵۲) اثبات کرامات الاولیاء پر ہے ، (صفحہ ۱۵۸ - ۱۶۵)

یہ باب متعدد فصلوں میں تقسیم ہے ، اور ان میں کرامت کے امکان و وقوع شرائط وقوع وغیرہ پر گفتگو ہے ۔

باب (۵۳) کا عنوان باب رویا النوم ہے (صفہ ۱۷۵ - ۱۸۰)

اس میں اہمیت نوم ، رویائے صالحہ ، پریشان خوابی اور مسائل متعلقہ پر تفصیلی بحث ہے ،

باب (۵۴) باب وصیۃ للمریدین ہے (صفہ ۱۸۰ - ۱۸۶)

کتاب کا سب سے بڑھ کر قابل غور باب یہی ہے ، اور اس لحاظ سے سب سے زیادہ اہم بھی ، کہ سابق کے ابواب میں تو عموماً اقوال وحکایات کی نقل کی گئی ہے لیکن اس باب میں شیخ نے اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر مریدین وطالبین کے لئے کچھ ہدایتیں اور نصیحتیں تحریر کی ہیں ، اس باب کو کتاب کا خلاصہ یا نچوڑ اور مکتب تصوف کا دستور العمل سمجھنا چاہیئے ۔

یہ باب چھوٹی چھوٹی فصلوں میں تقسیم ہے ، اور ہر فصل میں کسی اہم حقیقت یا نصیحت کو مختصر لفظوں میں قلمبند کر دیا ہے ، چند ملاحظہ ہوں ،

(الف) وبناء ھذا الامر وملاکہ علی حفظ آداب الشریعۃ وصون الید عن المد الی الحرام والشبھۃ وحفظ الحواس عن المحظورات وعد الانفاس مع اللہ تعالیٰ عن الغفلات (صہ ۱۸۵)	تصوف کی ساری بنیاد اسی پر ہے کہ آداب شریعت کی پابندی رہے ، حرام اور مشتبہ چیزوں سے دست کشی کی جائے ، ناجائز اوہام وخیالات سے حواس کو آلودہ نہ کیا جائے اور غفلتوں سے بچ کر اللہ تعالیٰ کی یاد میں وقت گذاری کی جائے ،
(ب) ومن شان المرید دوام	مرید کو ترک شہوات کے مجاہدہ

المجاهدة فی ترک الشهوات فان من وافق شهوته عدم صفوته واقبح الخصال بالمريد ورجوعه الی شهوة ترکها الله تعالیٰ، (ص ۱۸۵)

...دائماً مشغول رہنا چاہیئے، خواہشوں کی پابندی اور روح کی پاکیزگی کا ساتھ نہیں ہو سکتا اور مرید کے لئے یہ بد ترین پستی ہے کہ جس خواہش کو اللہ کے لئے چھوڑ چکا، اسکی جانب پھر رجوع کرے،

(ج) ومن شان المريد حفظ عهوده مع الله تعالیٰ فان نقض العهد فی طريق الارادة کالردة الدين لاهل الظاهر (ص ۱۸۵)

طالب کو اسکی بڑی احتیاط چاہیئے کہ ایک مرتبہ جس بات کا عہد خداوند تعالیٰ سے کر لیا، اسے نہ توڑے، طریقت میں نقض عہد کا وہی درجہ ہے جو شریعت ظاہری میں ارتداد کا ہے۔

(د) ومن شان المريد قصر الامل فان الفقير ابن وقته فاذا کان له تدبير فی المستقبل و تطلع لغير ما هو فيه من الوقت وامل فيما يستانفه لا يجيء منه شيء (ص ۱۸۶)

طالب کو چاہیئے کہ دامانِ آرزو کو بہت نہ پھیلائے، فقیر کو صرف حال سے سروکار رکھنا چاہیئے مستقبل کے خیالی پلاؤ پکاتے رہنا اس کی شان نہیں،

(ہ) ولا ينبغی للمريد ان يعتقد فی المشائخ العصمة بل الواجب ان يذرهم واحوالهم فيحسن بهم الظن (ص ۲۰۳)

مرید کو یہ نہ چاہیئے کہ اپنے مشائخ کے معصوم ہونے کا عقیدہ رکھے، البتہ ان سے حسنِ ظن رکھنا واجب ہے،

(و) ومن شان المريد التباعد من

اہل دنیا کی صحبت سے طالب کو ہر طرح

ابناء الدنیا فان صحبتهم سم	بچنا چاہیئے اور اسے اپنے حق میں زہر
مجرب لا نھم ینتفون بہ وھو	سمجھنا چاہیئے، زاہد تقرب الہیٰ
ینتقص بھم وان الزھاد یخرجون	کے لئے مال کو اپنے پاس سے دور کرتے
المال عن الکیس تقربا الی اللہ	رہتے ہیں اور صوفی تحقق الہی کی غرض
تعالیٰ واھل الصفاء یخرجون	سے خلائق سے اپنے قلب کو خالی کرتے
الخلق والمعارف من القلب	رہتے ہیں۔
تحققا باللہ تعالیٰ (ص۱۸۶)	

(ز) خوش گلو لڑکوں اور امردوں سے دوستی آج کل کی نہیں، اس زمانہ کا یہ مرض ہے، جائز کرنے والوں کو نفس نے عجب عجب تاویلیں سمجھادی ہیں، ابن شیخ کی تحقیق میں، اصعب الآفات فی ھذہ الطریقۃ یہ سخت ترین خطرہ راہ ہے شیخ اُس پر بہت زور سے متنبہ کرتے ہیں اور ڈراتے ہیں کہ بالفرض سالک رتبۂ شہداء تک پہونچ گیا ہو، تو اس عمل کی بے برکتی سے سب کچھ چھن جاتا ہے، اور اس کی پوری طرح رسوائی ہو کر رہتی ہے ذیل میں ان کے بیان کی صرف ابتدائی سطریں بلا ترجمہ درج کی جاتی ہیں،

ومن اصعب الآفات فی ھذہ الطریقۃ صحبۃ الاحداث ومن ابتلاہ اللہ تعالیٰ بشیٔ من ذالک فباجماع الشیوخ ذلک عبد اھانہ اللہ عزوجل وخذلہ بل عن نفسہ شغلہ ولو بالف الف کرامۃ اھلہ وھب انہ بلغ رتبۃ الشھداء (ص۱۸۲)

کتاب کے سارے مطالب کا لب لباب نظر کے سامنے آگیا، رواجی اور بدعتی تصوف کے لئے سندِ جواز کوئی ہلکی سے بھی ہلکی ہاتھ آئی؟

(۴) فتوح الغیب[1]

(شیخ عبدالقادر محی الدین جیلانیؒ)

(۱) مصنف

اگر یہ سوال کیا جائے کہ صوفیۂ کرام کے سارے سلسلوں میں شہرت عام اور مقبولیت انام سب سے زیادہ کس کے حصہ میں آئی ہے؟ تو عجب نہیں کہ متفقہ طور پر نام حضرت شیخ جیلانیؒ ہی کا زبانوں پر آ گیا ہے، دوسرے بزرگوں کے تعلقے پھر محدود ہیں، شیخ جیلانیؒ کا نام خواص اور عوام سب کی زبان پر ہے، مختلف ناموں اور تعظیمی لقبوں کے ساتھ "غوث اعظم" "محبوب سبحانی" وغیرہ متعدد چلتے ہوئے نام اور لقب ہیں، آپ کا زمانہ قدماء صوفیہ کا آخر زمانہ تھا، اس لئے بھی آپ کے ارشادات اور زیادہ توجہ کے مستحق ہیں،

اسم مبارک عبدالقادر تھا، کنیت ابو محمد، محی الدین لقب قرار پایا، متاخرین نے فرط عقیدت سے متعدد القاب کا اضافہ کر دیا،

سیادت نسبی دونوں طرف سے حاصل تھی، والد ماجد کی طرف سے سلسلۂ نسب

---

[1] ماخذ: (۱) نشر المحاسن الغالیہ فی فضل مشائخ الصوفیہ - از عبداللہ یافعی (قلمی) (۲) قلائد الجواہر فی مناقب شیخ عبدالقادر، از محمد بن یحییٰ حلبی (۳) طبقات الکبریٰ، از شیخ عبدالوہاب شعرانی (۴) اخبار الاخیار، از شیخ عبدالحق محدث دہلوی (۵) نفحات الانس از ملا جامی (۶) سفینۃ الاولیاء از دارا شکوہ، (۷) انسائیکلو پیڈیا آف اسلام، مقالہ عبدالقادر (قدیم و جدید ایڈیشن)

سیدنا حضرت حسنؓ تک پہونچتا ہے، اور والدۂ ماجدہ کی طرف سے سیدنا حضرت حسینؓ تک، اسی لئے نام کے ساتھ حسنی وحسینی لکھا جاتا ہے، سایۂ پدری بچپن ہی میں سر سے اُٹھ گیا تھا،

ولادت باختلاف روایت ۴۷۰ھ یا ۴۷۱ھ میں ہوئی، مولد نواح طبرستان میں قصبہ گیل یان ہے اسی کو عربی میں جیلان کہتے ہیں، سال وفات میں کوئی اختلاف نہیں ۵۶۱ھ ہے، عمر شریف ۹۰ سال کی ہوئی، ماہ ربیع الثانی بھی سب کو مسلم ہے، البتہ تاریخ میں اختلاف ہے، ۸ ربیع الثانی، ۱۰ ربیع الثانی، ۱۱ ربیع الثانی، ۱۳ ربیع الثانی، ۱۷ ربیع الثانی سب نقل ہوئی ہیں، دارا شکوہ نے ان سب کو چھوڑ کر ۹ ربیع الثانی کو اختیار کیا ہے، ۱۸ سال کی عمر میں بغداد آگئے، عمر کا بیشتر حصہ یہیں گذرا، یہیں وفات پائی، یہیں مدفون ہوئے۔

سلسلۂ تعلیم کی ابتدا قرآن مجید سے ہوئی، حفظ کیا، پھر ادب و فقہ و حدیث کی تحصیل اور باضابطہ تکمیل اپنے زمانہ کے کامل استادوں اور ماہرین فن سے کی۔ نظر کی وسعت اور علم کے تبحر کی گواہ خود آپ کی دونوں کتابیں غنیۃ الطالبین اور فتوح الغیب ہیں، فقہ میں مسلک احمد بن حنبل پر تھے، تدریس، فتویٰ نویسی اور وعظ گوئی کے مشغلے سالہا سال جاری رہے، ایک بڑے گروہ نے علوم ظاہری میں شاگردی کی۔ استفتے دور دور سے آتے، آپ برجستہ جواب تحریر کرا دیتے،

طریق باطنی کی تعلیم شیخ حماد، قاضی ابو سعید مبارک مخزومی اور شیخ ابو یوسف یعقوب ہمدانی سے پائی، شیخ خرقہ قاضی ابو سعید مخزومی تھے، شیخ صحبت شیخ حماد رہے، نسبت ارادت راہ راست سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے تھی اور اہل تذکرہ کا بیان ہے کہ انوار و فیوض کا نزول اسی سرکار سے ہوتا تھا

تذکروں میں کرامت اور خرق عادت کے واقعات اس کثرت سے مذکور ہیں کہ شاید ہی کسی دوسرے بزرگ کے ہوں، امام یافعیؒ کہتے ہیں کہ شیخ کی کرامتوں کی تعداد حد شمار

سے خارج ہے، اور اکثر (حسب اصطلاح صوفیہ) تواتر یا تقریباً تواتر تک پہنچی ہوئی ہیں

داراشکوہ کے الفاظ، بہت کچھ لکھنے کے باوجود یہ ہیں،

اگر آنچہ از آنحضرت در ایام حیات بظہور رسیدہ و آنچہ الحال نیز مشاہدہ نمودہ می شود می گفتم کتاب کلانے می شود،

حضرت سے جو واقعات زندگی میں صادر ہوئے میں آتے رہے، اور جو آج بھی مشاہدہ میں آرہے ہیں، ان سب کو جمع کیا جائے تو کتاب ضخیم ہو جائے۔

شیخ عبد الحق دہلوی، حضرت کے ایک معاصر بزرگ شیخ علی ہیتی کی شہادت نقل کرتے ہیں کہ :-

ندیدم شیخے از اہل زمان خود اکثر الکرامات از شیخ عبد القادر ہر وقت ہر کہ از ما خواہد کہ از وے کرامتے مشاہدہ کند می کند، خوارق ظاہر گردد، گاہے از وے گاہے در وے گاہے بوے،

انھوں نے اپنے زمانہ میں کسی کو شیخ عبد القادر سے بڑھ کر صاحب کرامات نہیں پایا جب وقت جو ان سے کرامت کا مشاہدہ کرنا چاہے، کر لیتا ہو، خرق عادت کبھی خود انہی سے ظاہر ہوتی ہے، کبھی ان کے متعلق اور کبھی ان کے ذریعے

آپ کی والدہ ماجدہ ایک ایسی کرامت کا ذکر کرتی ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی ولایت مادر زاد تھی، فرماتی ہیں، کہ شروع ہی سے احکام شریعت کا یہ التزام تھا کہ رمضان بھر دن میں دودھ نہیں پیتے تھے، اتفاق سے ۲۹ شعبان کو ابر تھا، چاند نہ دکھائی دیا، دوسرے دن اس بچہ نے دودھ نہ پیا، آخر تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ چاند ہو گیا تھا، اور اس دن یکم رمضان تھی،

ایک دوسری روایت ہے کہ بچپن کا زمانہ تھا، آبادی کے باہر کھیل رہے تھے، کہ ایک گائے کی دُم پکڑ کر کھینچی، وہ قدرت حق سے گویا ہو گئی، اور پلٹ کر اس نے

کہا "اے عبدالقادر تم دنیا میں اس غرض سے نہیں بھیجے گئے ہو۔" معاً اسے چھوڑ دیا، دل پر ہیبت طاری ہوئی، مکان آکر بالاخانہ سے جو نظر کی تو دیکھا کہ سامنے میدان عرفات ہے، اور حاجیوں کی قطاریں، والدہ ماجدہ سے آکر عرض کی کہ راہ خدا طے کرنے کی اجازت دیجئے، بغداد جاکر تحصیل علم کروں، انھوں نے سبب پوچھا کل واقعہ ان سے بیان کیا، ان نیک دل خاتون پر رقت طاری ہوگئی، اٹھ کر گئیں، ایک تھیلی لاکر فرزند نامدار کے ہاتھ میں دیدی، اور فرمایا کہ "بیٹا تمھارے والد مرحوم کل اسّی دینار چھوڑ گئے تھے، چالیس کی امانت تمھارے بھائی کے لئے محفوظ ہے، یہ چالیس تمھارے حوالہ، میری نصیحت وصیت، جو کچھ مجھ سب اتنی ہے، کہ راستی کو کسی حالت میں نہ چھوڑنا، جاؤ تمھیں اللہ کو سونپا، اب قیامت کے دن دیکھنے کو ملو گے۔"

راستہ میں ڈاکوؤں نے قافلہ پر حملہ کیا، ہر شخص مال چھپانے، جان بچانے کی فکر میں ہوا، اس سعادت مند فرزند اور اللہ کے برگزیدہ بندہ نے صاف صاف اپنے پاس کی مالیت کو بیان کر دیا، قزاق راست بازی اور دیانت کی اس کرامت پر دنگ رہ گئے، آخر اپنے پیشہ سے تائب ہو کر داخل بیعت ہوئے۔

منزل صدق میں شاید اسی قیام واستقامت کا یہ نتیجہ نکلا کہ آگے چل کر وہ مرتبہ اعظم حاصل ہوا، جو مقام صدیقیت کے لئے مخصوص ہے، اور رہروں کے لئے تو کیا، اچھے اچھے رہبروں اور رہنماؤں تک کے لئے باعث رشک، فرماتے تھے، کہ جب تک پہننے کا حکم نہیں ملتا، نہیں پہنتا ہوں، جب تک کھانے کا حکم نہیں ملتا، نہیں کھاتا ہوں، جب تک بولنے کا حکم نہیں ملتا نہیں بولتا ہوں،

تصانیف متعدد چھوڑیں، مندرجۂ ذیل یا تو خود موجود ہیں یا انکے نام دوسری کتابوں میں محفوظ ہیں،

(۱) غنیۃ الطالبین — فقہ حنبلی کی مشہور کتاب

(۲) فتوح الغیب — فن سلوک پر

(۳) الفتح الربانی — مجموعۂ مواعظ

(۴) جلاء الخاطر

(۵) الیواقیت والحکم

(۶) الفیوضات الربانیہ

(۷) حزب بشائر الخیرات

(۸) المواہب الرحمانیہ

یہ سب نام مارگولیتھ نے انسائیکلوپیڈیا (قدیم ایڈیشن) آف اسلام میں مقالۂ عبد القادر محی الدین جیلانی" کے تحت میں درج کئے ہیں۔

مارگولیتھ ہی نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ سب کتابیں شیخ کے فضل و کمال تفقہ فی الدین اور تبحر علمی کی زبردست گواہ ہیں،

بادشاہوں سے یہ ہدیہ نہیں قبول فرماتے تھے، ان کے علاوہ اگر کوئی شخص تحفہ لے آتا تو قبول فرمالیتے، اور اسی وقت حاضرین میں تقسیم فرمادیتے، ایک روز خلیفۂ وقت المستنجد باللہ نے حاضر ہو کر اشرفیوں کے دس توڑے پیش کئے، حسب معمول انکار فرمایا، ادھر سے اصرار بڑھا، شیخؒ نے ایک توڑا اپنے داہنے ہاتھ اور دوسرا بائیں ہاتھ سے اٹھاکر دونوں کو رگڑا، تو اشرفیوں سے خون بہنے لگا خلیفہ سے ارشاد ہوا کہ" اللہ سے شرم نہیں آتی کہ انسان کا خون کھاتے ہو، اور اسے جمع کر کر کے میرے پاس لاتے ہو" راوی کا بیان ہے کہ خلیفہ پر اتنا اثر پڑا کہ غشی کی نوبت آگئی،

خلیفۂ وقت یا کسی صاحب ثروت کے ہاں جانے کی عادت نہ تھی، اور نہ امراء کی تعظیم فرماتے، اگر خلیفہ کی آمد سنتے تو اٹھ کر مکان کے اندر تشریف لے جاتے اور پھر باہر نکل آتے، تاکہ خلیفہ کی تعظیم کے لئے اٹھنے کا سوال ہی نہ پیدا ہو جب خلیفہ کے نام نامۂ مبارک کی ضرورت پیش آتی، تو یوں تحریر فرمایا جاتا کہ "عبد القادر کا تجھے ارشاد ہے، اور اس کا ارشاد تیرے اوپر نافذ ہے" خلیفہ ان تحریروں کو سر اور آنکھوں پر جگہ دیتا،

صحیفہ زندگی کی ہر سطر احکام شریعت کے مطابق و ماتحت تھی، وعظ بیان فرماتے تھے تو قرآن مجید ہی سے، مکتوب تحریر فرماتے تو بھی اسی سرچشمۂ نور و ہدایت سے، تعلیمات میں سب سے زیادہ زور پابندی شریعت اور پیروی سنت پر ہوتا، وفات پر ذرا پیشتر مشائخ عصر کا مجمع تھا، بڑے صاحبزادے سیف الدین عبدالوہاب نے عرض کی، کہ حضرت کچھ وصیت فرمائیے، ارشاد ہوا،

علیک بتقوی اللہ وطاعتہ ولا تخف احداً ولا ترج و وکل الحوائج الی اللہ واطلبہا منہ ولا تثق باحد سوی اللہ خذ التوحید التوحید التوحید اجماع الکل	اللہ کے تقوی اور اطاعت کو اپنے اوپر لازم رکھو، بجز اللہ کے کسی سے نہ خوف رکھو نہ امید، تمام حاجتیں بس اللہ ہی کے سپرد کردو اور اسی سے طلب کرتے رہو اور بجز اللہ کے کسی پر اعتماد نہ رکھو، اپنے اوپر لازم کرلو توحید کو، توحید کو، توحید کو کہ اسی پر سب کا اجماع ہے،

عبادتوں اور ریاضتوں کی کثرت کا اندازہ ان روایتوں سے ہو سکتا ہے کہ چالیس سال تک عشاء کے وضو سے نماز فجر ادا کی، پندرہ سال تک یہ معمول رہا کہ بعد عشاء پورا کلام مجید ختم فرماتے تھے پچیس سال تک صحرا میں اس تنہائی سے بسر کی کہ انسان کی شکل بھی نہیں دیکھی،

سالہا سال کی عبادتوں، ریاضتوں اور مجاہدوں کے بعد خود بیان فرماتے ہیں کہ ایک بار مجھے بہت بڑا نور نظر آیا جو دیکھتے دیکھتے سارے افق پر چھا گیا۔ اس میں سے آواز آئی "اے عبدالقادر میں تیرا پروردگار ہوں، میں نے تیرے لئے حرام چیزوں کو حلال کردیا۔" میں نے لاحول ولا قوۃ پڑھ کر کہا دور ہو ملعون، بس وہ نور تاریکی میں تبدیل ہو گیا اور

اُس میں سے آواز آئی "عبد القادر، تو اپنے علم کی قوت سے مجھ سے بچ گیا، ورنہ میں تجھ جیسے ستر کاملوں کو گمراہ کرچکا ہوں۔" میں نے کہا ملعون تو اب بھی مجھے گمراہ کرنے میں لگا ہوا ہے۔ کہتا ہے کہ تم اپنے علم کی قوت سے بچ گئے، حالانکہ مجھے بچانے والی میری کوئی بھی قوت نہیں، محض اللہ کا فضل و کرم ہے۔"

ذوق عبادت اور غلبۂ خشوع و تواضع کا اندازہ گلستاں کی حکایت ذیل سے ہوگا۔

عبد القادر گیلانی را دیدند رحمۃ اللہ علیہ در حرم کعبہ روے بر حصا نہادہ بود و می گفت اے خداوند بخشاے و اگر مستوجب عقوبتم مرا بروز قیامت نابینا برانگیز تا در روے نیکاں شرمسار نباشم (باب ۲ حکایت ۳)

عبد القادر گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کو لوگوں نے دیکھا، آپ حرم شریف میں سنگریزوں پر منہ رکھے ہوئے عرض کر رہے تھے کہ اے خداوند مجھے بخش دے، اور اگر میں لائق عذاب سمجھا جاؤں تو قیامت کے دن مجھے نابینا اٹھانا تاکہ تیرے نیک بندوں کے سامنے شرمندہ نہ ہوں،

یہ خیال رہے کہ صاحب گلستاں شیخ سعدیؒ کا زمانہ حضرت جیلانیؒ سے کچھ ہی بعد کا تھا، اور شیخ حضرت گیلانیؒ کے ایک واسطہ سے مرید بھی تھے، یعنی شیخ حضرت شہاب الدین سہروردی کے مرید تھے، اور حضرت سہروردیؒ حضرت گیلانیؒ کے خلیفہ تھے۔ آپ کی عبدیت و عبودیت کا قدر شناس شیخ سعدی سے بڑھ کر کون ہو سکتا تھا۔

(ب) تصنیف

فتوح الغیب آج سے تین ساڑھے تین سو سال سے اُدھر دنیا کے لئے خود پردہ غیب میں تھی، شیخ سیف الدین عبد الحق محدث دہلوی (المتوفی ۱۰۵۱ھ) جب

فریضۂ حج ادا کرنے گئے تو مکہ معظمہ میں ایک نسخہ اس کتاب کا انھیں شیخ عبد الوہاب المتقی قادری کے ہاں ان کی نظر سے گذرا، ہندوستان واپس آئے تو ایک دوسرا نسخہ بھی انھیں مل گیا، فتوح الغیب عربی میں تھی، شیخ نے فارسی میں اس کا ترجمہ کیا، کہ وہی اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں کی زبان تھی، اور مفتاح الفتوح کے نام سے شرح بھی لکھی، فتوح الغیب کا موجودہ مطبوعہ نسخہ شیخ ہی کے ترتیب اور تہذیب دئے ہوئے نسخہ کی نقل ہے، لکھنؤ اور لاہور سے ان کی شرح کے ساتھ شائع ہوئی ہے،

کتاب حمد و نعت کے بعد اٹھتر مختصر مقالوں میں تقسیم ہے۔ آخر میں چند ورق مصنف کے حالات، مرض، وفات وغیرہ سے متعلق مرتب نے اضافہ کئے ہیں،

(۱) مقالہ اول (ص ۹-۱۰) تعمیل اوامر، اجتنابِ نواہی و رضا بالقضا پر ہے، فرماتے ہیں،

لا بد لکل مومن فی سائر احوالہ من ثلثۃ اشیاء امر یمتثلہ ونھی یجتنبہ وقدر یرضی بہ فاقل حالۃ لا یخلو المومن فیھا من احد ھذہ الاشیاء الثلثۃ،

ہر مومن کے لئے ہر حال میں یہ تین چیزیں لازمی ہیں، ایک یہ کہ حکم الٰہی کی تعمیل کرے، دوسرے یہ کہ ممنوع سے بچتا رہے، تیسرے یہ کہ قضائے الٰہی پر راضی رہے۔ پس مومن کے لئے کم سے کم مرتبہ یہ ہے کہ ان تینوں چیزوں سے خالی نہ ہو،

(۲) مقالۂ دوم (ص ۱۱-۱۲) اتباع سنت و ترک بدعت پر ہے، آغاز کلام یوں کرتے ہیں:-

اتبعوا ولا تبتدعوا واطیعوا ولا تتفرقوا وحدوا ولا

پیروی (سنت) کرتے رہو اور راہ بدعت نہ اختیار کرو، اطاعت کرو،

تنفرکو او یفعل اللہ ما یشاء	اور دائرۂ طاعت سے باہر نہ ہو،
و یحکم ما یرید و نزھوا الحق	توحید خداوندی کو مانو اور کسی کو
ولا تتھموا و صدقوا ولا تشکوا	اس کا شریک نہ ٹھہراؤ، کہ وہی جو کچھ
واصبروا ولا تجزعوا واجمعوا	چاہتا ہے اپنی مشیت سے کرتا ہے،
علی الطاعۃ ولا تتفرقوا،	اس کو ہر عیب سے پاک سمجھو اور اس
	پر تہمت نہ لگاؤ، اور تصدیق (اسلام)
	کرو اور شک میں نہ پڑو، صبر سے کام
	لو اور بے صبری نہ کرو، طاعت حق
	پر جمے رہو، اور جماعت میں تفرقہ
	نہ ڈالو،

آگے چل کر اس مقالہ میں یہ تعلیم ہے کہ گناہوں سے توبہ کرنے اور غفلت کے دور کرنے میں تاخیر نہ کرو، اور شب و روز استغفار تقصیر اور رجوع الی اللہ کرنے کو اپنے اوپر بار نہ سمجھو،

(۳) مقالہ سوم (صفحہ ۱۴-۱۰) اس بحث سے متعلق ہے کہ ابتلاء و مصیبت سے بندہ کے لئے مقصود کیا ہوتا ہے،

اس میں بڑی خوبی اور صحت کے ساتھ سالک کی نفسیت کی تشریح کی ہے فرماتے ہیں کہ جب انسان پر کسی قسم کا دکھ درد وارد ہوتا ہے، تو سب سے پیشتر تو وہ اپنی ذاتی قوت و تدبیر سے اس کے دفع کرنے کی کوشش کرتا ہے، جب اس میں کامیابی نہیں ہوتی تو خلق کی جانب رجوع کرتا ہے، مثلاً سلاطین، امراء اور اہلِ ثروت وغیرہ سے، یا اگر بیمار ہو تو اطباء کی جانب رجوع کرتا ہے، جب اس میں بھی ناکام ہو چکتا ہے تو پروردگار عالم کی درگاہ میں دعا و تضرع کے ذریعہ سے حاضر ہوتا ہے، انسان کی فطرت ہی ایسی واقع ہوئی

ہے کہ جب تک وہ خود دفع مضرت پر قادر ہے، خلق سے بے نیاز رہتا ہے، جب اپنے تئیں مجبور پاتا ہے، تو خلق کے سامنے دستِ اعانت دراز کرتا ہے، جب ادھر سے بھی سہارا نہیں رہتا تو خالق کے آستانہ پر جبین نیاز رگڑتا ہے، اور نہایت خشوع و خضوع، الحاح و زاری کے ساتھ کبھی امیدوارانہ، کبھی مایوسانہ دعا میں مشغول ہو جاتا ہے، جب مشیت الٰہی اس کو اس میں بھی ناکام رکھتی ہے، اور اس کی دعا قبول نہیں ہوتی تو رفتہ رفتہ اس کی نظر میں تمام اسباب بے حقیقت ہو جاتے ہیں، اور اسے انقطاع الی اللہ حاصل ہو جاتا ہے اس وقت بندہ تمام تعلقات سے آزاد، روح مجرد رہ جاتا ہے، اور اوصاف بشریت، ہوا و ہوس خواہش، آرزو وغیرہ اس سے رخصت ہو جاتے ہیں، اس وقت اسے اتنی صفائی باطن اور نورانیت قلب حاصل ہو جاتی ہے کہ اسے ہر فعل کی فاعل ذات خالق ہی نظر آنے لگتی ہے، اور یہ یقین شہودی حاصل ہو جاتا ہے کہ تمام موجودات میں فاعل حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے، اور ہر راحت و سکون، ہر خیر و شر، ہر سود و زیان، ہر عطا و بخل، ہر کشائش و بندش، ہر موت و حیات، ہر عزت و ذلت، ہر تونگری و افلاس کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ قادر مطلق ہی کی قدرت کا ایک ظہور ہے۔ تا آنکہ یہ سلسلۂ معرفت کامل پر جاکر منتہی ہوتا ہے، یعنی بندہ کو ہر شے کا مبدا و مرجع ذات خداوندی ہی محسوس ہونے لگتی ہے، اسرار قدرت اس پر روشن ہونے لگتے ہیں، وہ خالق ہی کے کان سے سنتا ہے، اسی کی حمد و ثنا، شکر و دعا میں لگ جاتا ہے،

اب ذیل میں باقی چھ بابوں میں سے جستہ جستہ کے صرف عنوانات ملاحظہ فرمائیے، اوپر کے مختصر تعارف کے بعد یقین ہے کہ محض "لفافہ" سے "مضمون" کا اندازہ ہو جائے گا،

(۴) المقالة الرابعة فی مراتب الموت عن الخلق والھوی والارادة (ص ۱۸-۲۵)	چوتھا باب، مخلوقات اور خواہش اور ارادہ کی طرف سے فنا کے مراتب ہیں،

(۵) المقالة الخامسة فی تشبیه حال الدنیا واشتغال اهلها بها (ص ۲۵-۲۶)	پانچواں باب، دنیا اور دنیا کی طرف اہل دنیا کی مشغولیت کی مثال میں،
(۶) المقالة السادسة فی الغنا من الخلق والهوی (ص ۲۶-۴۰)	چھٹا باب، مخلوقات اور خواہش سے بے نیازی کے بیان میں،
(۹) المقالة التاسعة فی بیان الکشف والمشاهدة (ص ۶۰-۶۴)	نواں باب کشف ومشاہدہ کے بیان میں،
(۱۰) المقالة العاشرة فی بیان مخالفة النفس (ص ۶۴-۷۸)	دسواں باب مخالفت نفس کے بیان میں،
(۱۳) المقالة الثالثة عشر فی التعلیم علی قضاء الله و قدره (ص ۸۱-۸۹)	تیرہواں باب قضائے الٰہی کی تعلیم و رضا کے بیان میں،
(۱۶) المقالة السادسة عشر فی المنع عن الاعتماد علی الخلق والاسباب (ص ۹۹-۱۰۰)	سولہواں باب، مخلوقات اور اسباب پر تکیہ کرنے سے ممانعت کے بیان میں،
(۱۷) المقالة السابعة عشر فی معنی الوصول الی الله تعالیٰ (ص ۱۰۰-۱۰۴)	سترہواں باب وصول الی اللہ کے معنی کے بیان میں۔
(۱۸) المقالة الثامنة عشر فی بیان معنی الرضاء (ص ۱۰۱-۱۱۵)	اٹھارہواں باب، رضا کے معنی کے بیان میں،
(۲۳) المقالة الثالثة والعشرون فی بیان القناعة (ص ۱۲۳-۱۲۷)	تئیسواں باب، قناعت کے بیان میں،

(۲۷) المقالة السابعة والعشرون فی بیان الخیر والشر (ص ۱۵۸-۱۶۹)	ستائیسواں باب خیر و شر کے بیان میں،
(۳۸) المقالة الثامنة والثلثون فی بیان الصدق والاخلاص فی سبحانه تعالیٰ (ص ۲۲۷-۲۲۸)	اڑتیسواں باب اللہ تعالیٰ کے حضور میں صدق و اخلاص رکھنے کے بیان میں،
(۴۸) المقالة الثامنة والاربعون فی حماقة من تشغل بالنوافل وعلیه فرائض (ص ۲۷۵)	اڑتالیسواں باب اس شخص کی حماقت کے بیان میں جس پر فرائض باقی ہوں اور وہ نوافل میں مشغول ہو جائے۔
(۵۰) المقالة الخمسون فی الزهد	پچاسواں باب زہد کے بیان میں۔
(۶۱) المقالة الحادی والستون فی بیان الورع والتقوی (ص ۳۴۱-۳۴۴)	اکسٹھواں باب، پرہیزگاری اور تقویٰ کے باب میں،
(۶۳) المقالة الثلثة والستون فی بیان الاخلاص والریا (ص ۳۴۳)	ترسٹھواں باب اخلاص اور ریاکاری کے بیان میں،
(۷۱) المقالة الحادی والسبعون فی الصبر مع البلاء (ص ۳۷۹-۳۸۴)	اکہترواں باب مصیبتوں پر صبر کے بیان میں،
(۷۸) المقالة الثامنة والسبعون فی بیان الخصال العشرة لارباب المحاسبة والمجاهدة (ص ۴۰۶ و ۴۱۸)	اٹھترواں باب اہل محاسبہ و مجاہدہ کی دس خصلتوں کے بیان میں،

اب ذیل میں متفرق مقامات سے جابجا اقوال و تعلیمات ملاحظہ کرتے چلئے،
باب ۵۷ میں شیخ اپنے فرزند کو دو دستور العمل بتاتے ہیں، جس سے انسان عارف

کامل بن سکتا ہے، آج کل کے "قادری" مشایخ کو یہ سن کر بڑی ہی مایوسی ہوگی، کہ ان کے شیخ الشیوخ کے اس دستور العمل میں نہ کہیں تعلیم یا غوث پکارنے کی ہے، نہ کہیں یا شیخ عبد القادر جیلانی شیأ للہ کا نعرہ لگانے کی، نہ بڑی گیارہویں منانے کی، نہ خرقہ وجبہ کی زیارت کی، نہ کوئی نیاز، چڑھاوا، توشہ ماننے کی، بلکہ تمام تر تاکید ہے پابندی شریعت کی اور ضبط نفس اور مجاہدہ اور ادائے حقوق عباد کی، ارشاد ہوتا ہے:-

اوصیک بتقوی اللہ وطاعتہ ولزوم ظاہر الشرع و سلامۃ الصدر وسخا النفس وبشاشۃ الوجہ وبذل الندی وکف الاذی وحمل الاذی والفقر وحفظ حرمات المشائخ و حسن العشرۃ مع الاخوان والنصیحۃ للاصاغر وترک الخصومۃ مع الارفاق وملازمۃ الایثار ومجانبۃ الادخار (ص ۳۹۵-۳۹۶)

میں وصیت کرتا ہوں کہ اللہ کا تقویٰ اور طاعت اختیار کرو، اور احکام شریعت کی پابندی لازم رکھو اور سینہ کو خباثت نفس سے صاف رکھو اور نفس میں جوانمردی رکھو، اور کشادہ رو رہو، اور جوشے عطا کرنے کے قابل ہو اسے عطا کرتے رہو، اور ایذادہی سے باز رہو، اور خود آزار خلق کا تحمل کرتے رہو، اور آداب درویشی نگاہ میں رکھو، اور بزرگوں کی بزرگداشت کرتے رہو، اور برابر والوں سے حسن معاشرت رکھو اور خردوں کو نصیحت کرتے رہو اور اپنے رفیقوں سے جنگ نہ کرو اور ایثار کو اپنے

اور پر لازم کر لو اور ذخیرہ مال فراہم
کرنے سے بچو۔

فقر کی حقیقت دو لفظوں میں بیان فرما دی ہے :۔

نقر کی حقیقت یہ ہے کہ اپنی ہی جیسی ہستی (یعنی کسی بندہ) کا محتاج نہ رہ،	وحقیقۃ الفقران لا تفتقر الیٰ من ھو مثلک (ص ۳۹۶)

طریق تصوف کی تحصیل کس طرح انسان کے لئے ممکن ہے؟

قیل و قال (بحث و گفتگو) سے نہیں بلکہ گرسنگی سے اور دنیا کی خوشگوار و محبوب اشیا کے ترک سے،	والتصوف ما اخذ من القیل والقال ولکن اُخذ من الجوع وقطع المعروفات والمستحسنات

طریقت کی بنیاد کار ان آٹھ خصلتوں پر ہے، اُن میں سے ہر ایک کا مظہر ایک ایک نبی ہوا ہے، ان کے نقش قدم کی پیروی طالب سالک کے لئے ناگزیر ہے،

تصوف آٹھ خصلتوں پر مبنی ہے، سخاوت ابراہیمؑ پر، رضائے اسحٰقؑ پر، صبر ایوبؑ پر، مناجات زکریاؑ پر، غربت یحییٰؑ پر، خرقہ پوشی موسیٰؑ پر، تجرد عیسیٰؑ پر اور فقر محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر،	التصوف مبنی علی ثمان خصال السخاء لابراھیم والرضا لاسحٰق والصبر لایوب والاشارۃ لزکریا والغربۃ لیحییٰ ولبس الصوف لموسیٰ والسیاحۃ لعیسیٰ والفقر لمحمد صلی اللہ علیہ وسلم

ایک مرتبہ خواب میں دیکھا کہ ایک پیر مرد آپ سے دریافت کر رہے ہیں کہ بندہ کو اللہ سے قریب کرنے والی کون سی چیز ہے، آپ نے فرمایا کہ جو شے قرب الٰہی پیدا کرتی ہے، اس کا ایک درجہ ابتدائی ہے اور ایک انتہائی، درجۂ ابتدائی ورع (ممنوعات شرعی سے احتراز) ہے، اور درجہ انتہائی رضا و تسلیم و توکل (ص ۲۷)

لوگوں نے مدت سے ساری توجہ کا مرکز اوراد و اشغال یا نوافل کو بنا رکھا ہے اور فرائض و واجبات کو گویا بھلا دیا ہے، اور اسی کو درویشی سمجھ رہے ہیں، ایسے کم فہم آپ کے زمانہ میں بھی تھے، لیکن آپ کا ارشاد ہے،

ینبغی للمومن ان یشتغل اولاً بالفرائض فاذا فرغ منها اشتغل بالسنن ثم یشتغل بالنوافل فمن لو یفرغ من الفرائض فالا لا شتغال بالسنن حمق و رعونة فان اشتغل بالسنن والنوافل قبل الفرائض لم یقبل منه واهین، (ص ۲۷۲)	مومن کو چاہیئے کہ سب سے پہلے فرائض پر توجہ کرے، جب یہ ادا کر چکے تب سنتوں کو اختیار کرے، اسکے بعد نوافل پر متوجہ ہو، لیکن جو شخص ابھی فرائض ہی سے فارغ نہیں ہوا ہو اس کے لئے سنتوں میں مشغول ہو جانا حماقت و نادانی ہے، اس لئے کہ ادائے فرض کے بغیر سنن و نوافل غیر مقبول رہیں گے اور جو شخص ایسا کرے گا خوار ہو گا،

فرائض کو چھوڑے ہوئے سنن و نوافل میں مشغول ہونے والے کی

فمثله کمثل رجل یدعوه الملک الیٰ خدمته فلا یاتی الیه ویقف بخدمة الامیر الذی هو غلام الملک و خادمه وتحت یده	مثال اس شخص کی سی ہے کہ اسے بادشاہ تو اپنے پاس بلا رہا ہو، اور وہ بادشاہ کے حضور میں تو نہ جائے، بلکہ ایک امیر کی خدمت میں حاضر رہے جو خود ہی اس بادشاہ کا زبردست اور چاکر اور غلام ہے،

نمازی جب تک فرض نہ ادا کرے، اس کے نوافل غیر مقبول رہتے ہیں (صفحہ ۲۷۶)
اسی طرح اس نمازی کے نوافل جو سنتوں کو چھوڑ نوافل ادا کر رہا ہو (صفحہ ۲۷۶)
اور نماز کی سنتیں اور نفلیں تو پھر بھی ایک درجہ رکھتی ہیں، جب ان کا یہ حال
ہے، تو پھر ان طبع زاد اور اوراد و افکار، وظیفوں اور عزیمتوں میں مشغولی کی کیا بساط
ہے، جن کی کوئی سند، ضعیف بھی، رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم تک نہیں پہنچتی!
اور اکثر ان سے مقصود بھی دنیا ہی کسی نہ کسی شکل سے ہوتی ہے!

ایک قول اور سن کر کتاب کا ورق الٹ دیجیے ارشاد ہوا ہے کہ شرک محض
صنم پرستی کا نام نہیں، بلکہ اپنی خواہش نفس کی پیروی کرنا، یا اللہ کے علاوہ
غیر اللہ کی طلب کرنا، یہ سب شرک میں داخل ہے (صفحہ ۴۲-۴۳)

"قادریت" کے اس سب سے بڑے صحیفہ کے اس اجمالی مطالعہ کے بعد للہ
ارشاد ہو کہ آج "مشایخ قادریہ" کو اپنے جن رسوم پر ناز ہے، اور جن بدعتوں کا نام
انھوں نے طریق قادریہ رکھ لیا ہے، انھیں حضرت شیخ جیلانی کے تعلیم کئے ہوئے
فقر و تصوف سے کوئی بھی نسبت ہے؟

(۵) عوارف المعارف[۱]

(شیخ شہاب الدین سہروردیؒ)

(الف) تصنیف

پورا نام ابو حفص شہاب الدین عمر بن محمد البکری سہروردی ہے، عام لقب شیخ الشیوخ تھا، معاصر صوفیہ دور دور سے ان سے مسائل دریافت کرتے، اور مباحث تصوف کی تحقیق میں ان سے رجوع کرتے،

ولادت ماہ رجب ۵۳۹ھ میں ہوئی، وفات محرم ۶۳۲ھ میں ہوئی ۹۳ سال کی عمر پائی، مولد عراق عجم کا قصبہ سہرورد تھا، مزار بغداد میں ہے، قیام عموماً بغداد ہی میں رہا،

والد ماجد کا نام شیخ محمد قریشی ملتا ہے، سلسلۂ نسب ۱۲ واسطوں سے حضرت صدیق اکبرؓ تک پہونچتا ہے۔ مرجع خلائق تھے، حضرات صوفیہ میں ایک مسلّم امام سمجھے گئے ہیں، بلکہ چشتیہ، نقشبندیہ، قادریہ کی طرح ایک مستقل سلسلہ

۱؎ ماخذ:- (۱) نفحات الانس (جامیؒ) کلکتہ،
(۲) سفینۃ الاولیاء (داراشکوہ) لکھنؤ
(۳) خزینۃ الاصفیاء جلد ۲ (غلام سرور) لاہور
(۴) مدینۃ العلوم (ارنیقی) قلمی

سہروردیہ کے بانی،

ان کے حقیقی چچا شیخ ابوالنجیب سہروردیؒ خود ایک مشہور عارف اور صاحب سلسلہ بزرگ ہوئے ہیں، پہلے اُنہی کے مرید ہوئے، اور پرورش بھی انہی کے سایۂ عاطفت میں پائی، لیکن طبیعت کا رجحان علم کلام کی جانب تھا، اُن کی متعدد کتابیں ازبر کرلی تھیں شفیق چچا اکثر اس سے روکتے تھے، طبیعت کوئی اثر قبول نہ کرتی، ایک روز وہ حضرت شیخ جیلانیؒ کی خدمت میں انھیں ہمراہ لے حاضر ہوئے، شیخ کا سن وفات ۵۶۱ھ ہے، اس لئے شیخ شہابؒ کی عمر اس وقت زیادہ سے زیادہ ۲۰۔۲۱ سال کی ہوگی، چچا نے راستہ میں فرمایا کہ "دیکھو ایک ایسے بزرگ کی خدمت میں حاضر ہورہے ہیں، جن کا قلب اللہ تعالیٰ کی خبر دیتا ہے، ان کے دیدار کی برکتیں حاصل کرنا" حضرت کی خدمت میں پہونچ کر اُنھوں نے عرض کی کہ "حضرت میرا یہ بھتیجا علم کلام میں مشغول رہا کرتا ہے، ہرچند روکتا ہوں، اثر نہیں ہوتا" حضرت نے اُن سے مخاطب ہوکر پوچھا "عمر کون کون سی کتابیں پڑھی ہیں؟ انھوں نے نام گنائے حضرت نے سن کر اپنا دست مبارک ان کے سینہ پر پھیرا، روایت کے راویوں نے آگے خود شیخ کا یہ بیان نقل کیا ہے[1] کہ

"ہاتھ کا پھیرنا تھا کہ بجز ایک لفظ بھی مجھے ان کتابوں کا یاد نہ رہ گیا، خدا نے تمام مسائل کلامیہ میرے دل سے محو کردئے اور قلب کو علم لدنی سے لبریز کردیا"

علوم ظاہری و باطنی کے جامع تھے، ابن نقطی کے الفاظ ہیں،

کان فقیہاً فاضلاً صوفیاً	فقیہ فاضل تھے، صوفی متقی تھے،
ورعاً زاہداً عارفاً	زاہد عارف تھے، اپنے زمانہ میں

[1] بیان مشتبہ اس لئے کہ علم کلام بہرحال دین ہی کی خدمت اور اہم خدمت کے لئے ہے، اگر اس کے بجائے فلسفہ کا نام ہوتا تو روایت قرین قیاس ہوجاتی۔

شیخہ و قدوتی فی علم الحقیقۃ — علم طریقت کے شیخ تھے، تربیت
والیہ المنتھی فی تربیۃ المریدین — مریدین میں کامل تھے،

شیخ کے مریدین بہ کثرت تھے، اور کامل و فاضل جو بجائے خود صاحب سلسلہ ہوئے ہیں، مثلاً شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانی، شیخ حمید الدین ناگوری، شیخ نجیب الدین علی برغش وغیرہم،

متعدد تصانیف چھوڑیں، نام صرف چند کے معلوم ہیں،

۱۔ رشف النصائح،

۲۔ اعلام الھدیٰ فی عقیدۃ ارباب التقیٰ،

۳۔ بہجۃ الاسرار (مناقب غوث اعظم)

۴۔ عوارف المعارف

(ب) تصنیف

عوارف المعارف کا سنہ تصنیف ۵۶۰ھ ہے، شیخ اُس وقت بہت ہی کمسن تھے تاہم کتاب کو صوفیہ میں پوری طرح حسن قبول حاصل ہے، اور یہ کتاب ہر طبقہ میں مستند سمجھی گئی ہے، بلکہ متاخرین کے سلوک کے علمی حصہ کا بڑا ماخذ کہنا چاہیئے کہ یہی کتاب ہے، اصل عربی میں متعدد بار چھپ چکی ہے، فارسی ترجمے ایک سے زائد ہو چکے ہیں، اردو میں بھی ترجمہ شائع ہو چکا ہے،

کتاب کے دو حصے ہیں اور ۶۳ باب۔ ۳۲ باب حصہ اوّل کے ہیں اور ۳۱ حصہ دوم میں خطبۂ کتاب (آج کی اصطلاح میں مقدمۂ کتاب) میں حمد و نعت کے بعد ہی سببِ تالیف یہ بیان کرتے ہیں کہ گروہ صوفیہ میں انحطاط پیدا ہو چکا ہے، ان کے اعمال فاسد ہوتے جاتے ہیں، ان کے نقال بہت سے پیدا ہو گئے ہیں، اتباع کتاب و

سنت کا سررشتہ ہاتھوں سے چھوٹ گیا ہے، اور خلقت حقیقت تصوف کیجانب سے بدگمان ہو چلی ہے،

اس کے بعد ابواب کتاب کی فہرست درج کرتے ہیں، جو اس زمانہ کے دستور سے الگ ایک چیز تھی، اور اس کے خاتمہ پر جنید بغدادیؒ کا یہ قول نقل کرنے کے بعد کہ

"ہمارے اس علم (طریقت) کی بساط سالہا سال ہوئے کہ لپیٹ کر رکھدی گئی، اور ہم اب اس جگہ کے حاشیہ پر گفتگو کر رہے ہیں،

خود بہ صد تاسف و حسرت فرماتے ہیں کہ

بدا ھذا القول منہ فی وقتہ	یہ اس وقت ارشاد ہوا تھا جبکہ
مع قرب العھد بعلماء السلف	وہ وقت علمائے سلف و صلحائے
وصالحی التابعین فکیف	تابعین کے قریب تھا، تو اب
بنا مع بعد العھد وقلۃ العلماء	ہمارے زمانہ کا کیا بیان ہو جبکہ
الزاھدین والعارفین	اس قدر زمانہ اور گذر چکا ہے،
بحقائق علوم الدین	اور علمائے زاہدین اور حقائق
	دین کے عارف کم ہو گئے ہیں،

انحطاط طریق کی یہ صورت ۵۶۰ھ میں تھی، آج ۱۳۸۲ھ ہے، اس سوا آٹھ سو برس میں پستیاں کتنی حد سے گذر چکیں، ان کی تفصیل کے لئے کوئی قلم میں قوت کہاں سے لائے؟

مطالب کتاب کے ایک سرسری و اجمالی اندازہ کے لیے عنوانات پر جستہ جستہ نگاہ کافی ہوگی،

(۱) فی ذکر منشاء علوم الصوفیہ (ص ۵-۱۰)

اس میں علم تصوف اور علوم متعلقہ کی ابتدائی تاریخ اور ان کے مبداء اور

منشا کا بیان ہے،

(۲) فی ذکر تخصیص الصوفیہ بحسن الاستماع (صـ ۱۱-۱۶)

اس میں کلام الٰہی اور کلام رسولؐ کے حسن استماع اور اسکی برکتوں کا ذکر ہے،

(۵) پانچواں باب، ماہیت تصوف پر ہے، (صـ ۲۹-۳۳)

(۷) تا (۹) یہ تین باب متصوف، ملامتی اور مصنوعی اہل تصوف پر ہیں، (صـ ۳۶-۴۰)

(۱۰) یہ باب مرتبۂ شیخت کی شرح میں ہے، (صـ ۴۴-۴۶)

(۱۳) تا (۱۵) یہ تین باب اہل خانقاہ و اہل صفہ کی باہمی نسبت و تعلقات کے بیان میں ہے، (صـ ۵۵-۶۳)

(۱۶) تا (۱۸) یہ تین باب صوفیہ کے آداب سفر و قیام اور ان کے متعلقات پر ہیں، (صـ ۶۳-۷۷)

(۲۱) صوفیہ مجرد و متاہل کے احوال و مقاصد میں (صـ ۸۸-۹۱)

(۲۲) تا (۲۵) یہ چار باب سماع اور اس کے متعلقات کے آداب و شرائط کے نذر ہیں، (صـ ۹۱-۱۰۹)

(۲۹) و (۳۰) ان دو بابوں میں اخلاق صوفیہ کا بیان ہے (صـ ۱۲۰-۱۳۵)

(۳۲) فی آداب الحضرۃ الالٰہیۃ لاہل القرب، (صـ ۱۴۷-۱۵۰)

اہل قرب کے آداب حضوری پر ہے،

یہاں جلد اول ختم ہو گئی، آگے جلد دوم کے صفحات کے ہندسے ہیں،

(۳۳) تا (۳۵) تین باب مقدمات طہارت، وضو اور اس کے آداب اور وضو کے بیان میں ہیں، (صـ ۲-۸)

(۳۶) تا (۳۸) نماز اور اس کے فضائل، آداب و اسرار کا بیان ہے (صـ ۸-۲۲)

(۳۹) تا (۴۱) روزہ اور اس کے فضائل و اسرار کا بیان ہے (صـ۲۳-۲۷)

(۴۴) آداب ولباس پر ہے (صـ۳۳-۳۷)

(۴۵) و (۴۶) فضائل شب بیداری پر اور اسباب معین شب بیداری پر ہیں، (صـ۳۷-۴۱)

(۴۸) عبادات شب کی تقسیم میں ہے، (صـ۴۵-۴۷)

(۵۰) عبادات روز کی تقسیم میں ہے، (صـ۵۲-۵۹)

(۵۱) فرائض و آداب مرید پر ہے، (صـ۵۹-۶۵)

(۵۶) معرفت نفس و مکاشفۂ صوفیہ کے بیان میں ہے، (صـ۷۹-۸۸)

(۵۸) حال و مقام کی تشریح اور ان کا فرق، (صـ۹۲-۹۵)

(۶۰) مقامات کی تفصیل اور اس ضمن میں توبہ، صبر، ورع، فقر، شکر، خوف، رجا، توکل و رضا کا بیان، (صـ۱۰۱-۱۱۰)

(۶۱) احوال کی تشریح ہے، (صـ۱۱۱-۱۲۱)

(۶۲) بعض مصطلحات صوفیہ کی تشریح، جمع و تفرقہ، تجلی و استتار، غیبت و شہود، وغیرہ کا بیان (صـ۱۲۱-۱۳۶)

اکثر اکابر صوفیہ کی طرح شیخ سہروردیؒ بھی کتاب اللہ و سنت رسولؐ پر عبور رکھتے تھے، علوم قرآن کے فاضل اور فقہ و حدیث کے عالم تھے۔ جو کچھ لکھتے ہیں، اس میں برابر قال اللہ و قال الرسول سے استناد کرتے جاتے ہیں، یہاں تک کہ جو باب اصولی و تعلیمی حیثیت رکھتے ہیں، ان میں اکثر کا عنوان ہی کسی آیت یا حدیث کو رکھتے ہیں۔ گویا اس باب میں جو کچھ بیان ہوگا وہ قرآن و حدیث ہی سے مستنبط ہوگا، چند مثالیں اسکی بھی قابل ملاحظہ ہیں،

....

باب ۲۹ شرح حال اخلاق صوفیہ پر ہے۔ اس کا آغاز اس پورے ارشاد نبوی سے کرتے ہیں۔

قال انس بن مالك قال لی
رسول اللہ صلعم یا بنی ان
غدوت ان اصبح وتمسی ولیس
فی قلبك غش لاحد فافعل
ثم قال یا بنی وذالك من سنتی
من احیاء سنتی فقد احیانی
ومن احیانی کان معی فی الجنۃ

انس بن مالک کہتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے فرزند اگر تم صبح اور شام اس حال میں کرسکو کہ تمھارے دل میں کسی کی طرف سے میل نہ ہو تو ایسا کرو، پھر فرمایا اے فرزند میری سنت ہی، جس نے میری سنت کو زندہ کیا، اس نے خود مجھے زندہ کیا، اور جس نے مجھے زندہ کیا وہ میرے ساتھ جنت میں ہوگا۔

باب ۵۲ ادائے حقوق صحبت واخوت پر ہے، اس عنوان کو زینت آیاتِ ذیل دے رہی ہیں۔

۱۔ وتعاونوا علی البر والتقوی،

۲۔ وتواصوا بالحق وتواصوا بالمرحمۃ

۳۔ اشداء علی الکفار رحماء بینھم

باب ۶ مقامات سلوک پر ہے، اس کے تحتانی عنوانات میں مقام ورع کا آغاز اس حدیث سے کرتے ہیں، ملاك دینكم الورع

اور مقام خوف کا اس حدیث سے راس الحکمۃ مخافۃ اللہ،

اور مقام رجاء کا اس حدیث سے قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول اللہ عزوجل اخرجوا من النار من کان فی قلبہ مثقال حبۃ من خردل من ایمان ثم یقول وعزتی وجلالی

لہ اجعل من آمن بی ثنی ساعة من لیل او نہار مکن لا یومن بی،

باب ۳۳ مقدمات و آداب طہارت پر ہے، اس باب کا سرنامہ ذیل کی آیہ شریفہ کو بناتے ہیں، فیہ رجال یحبون ان یتطہروا واللّٰہ یحب المطہرین

اس وقت یہ جو عام خیال پھیلا ہوا یا پھیلا دیا گیا ہے کہ تصوف و طریقت دین اسلام سے الگ ایک مستقل نظام مذہبی کا نام ہے، اور اس خیال کے پھیلانے والوں میں یورپ کے پڑھے لکھے "مستشرق" بھی کسی سے پیچھے نہیں، تو اس خیال کی کامل اور قطعی تردید کے لئے اس رسالہ کے آخری باب بالکل کافی ہیں، ان میں طاؤس الفقراء سراج، شیخ علی ہجویری، امام ابو القاسم قشیریؒ، اور شیخ جیلانیؒ کے حوالوں سے یہ پوری طرح ظاہر ہو چکا ہے کہ تصوف اپنی اصلی اور خالص صورت میں اسلام سے الگ ہونا تو کجا، اسی کی کامل ترین صورت کا نام ہے، اور اس میں بیرونی عنصروں کی آمیزش تو اس وقت شروع ہوئی، جب خود تصوف میں انحطاط شروع ہو چکا تھا، اور دین کے ہر شعبہ اور ہر گوشہ میں بدعات داخل ہونے لگی تھیں۔

شیخ سہروردیؒ بھی اس باب میں دوسرے اکابر طریقت کے بالکل ہمزبان ہیں، ان کے نزدیک تصفیۂ قلب اور تزکیۂ نفس براہ راست تعلیمات مصطفویؐ کا ثمرہ ہے اور جو شخص اس سرچشمۂ رشد و ہدایت سے جتنا زیادہ سیراب ہوا، اسی قدر صفائے قلب و تزکیۂ نفس سے بھی وہ زیادہ بہرہ اندوز ہوا، (عوارف ص۶)

تفسیر، اصول تفسیر، حدیث، اصول حدیث، فقہ، اصول فقہ، علم کلام، علم الفرائض، معانی و بیان، لغت و نحو، غرض سارے علوم ظاہر جو فہم شریعت میں کام آتے ہیں، اور بظاہر ضد تصوف سمجھے جاتے ہیں، حقیقۃً وہ سب مقدمات و مبادی طریقت کا کام دے سکتے ہیں، (ص۸)

خلقت کی اصل ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم ہے، ساری کائنات اسی

کے طفیل میں ہے، اور یہی ذاتِ اقدس دنیا میں علم و ہدایت لے کر آئی، پس جو شخص اپنی پاکیزہ طینتی کے لحاظ سے جتنا زیادہ قرب و مناسبت اس جوہر گرامی سے رکھتا ہے، اُسی قدر وہ علم و ہدایت سے بہرہ اندوز ہوتا ہے، اور دوسروں کی ہدایت کا باعث بنتا ہے، یہی گروہ، گروہ صوفیہ ہے، یا قرآن کی اصطلاح میں گروہ مقربین (صفحہ ۹۰)

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:۔

فبشر عبادی الذین یستمعون القول فیتبعون احسنہ اولئک الذین ھداھم اللہ واولئک ھم اولوا الالباب (زمر ع ۲)	اے پیمبر، آپ ہمارے ان بندوں کو مژدہ پہونچا دیں جو ہمارے کلام کو حسن استماع کے ساتھ سنتے اور اسکی اچھی باتوں پر چلتے ہیں، یہی لوگ ہیں جنھیں اللہ نے ہدایت دی ہے، اور یہی لوگ صاحب عقل سلیم ہیں،

گویا ہدایت کا اصل راز حسن استماع ہے، پھر صوفیہ کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ آیت بالا کے لفظ "اولوا الالباب" میں جس شے کو "لب" یا دانش سے تعبیر کیا ہے، اس کے کل حصے سو ہیں، ان میں سے ننانوے حضرت رسالت صلعم کے حصہ میں آگئے، باقی ایک حصہ تمام کائنات کے مومنین پر تقسیم ہوا ہے، یہ مقدار بجائے خود اکیس حصول پر شامل ہے، اس کے ایک حصہ، یعنی کلمۂ شہادت میں سب کلمہ گو برابر کے شریک ہیں، رہے باقی بیس حصے، سو اُن میں مومنین بہ لحاظ اپنی قوت ایمانی کے ایک دوسرے سے برتر و فروتر ہیں، آیۂ بالا میں جس اَحْسَنُ القول کا ذکر ہے، وہ وہی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔ پس جو شخص اس کے اتباع اور اس کے حسن استماع میں جتنا زیادہ انہماک رکھے گا، اُسی قدر وہ صفت تقرب سے زیادہ موصوف ہوگا،

اور اسی صفت رکھنے والے کا نام صوفی ہے (صـ۱۳)

اور یہ جو کلام مجید میں ارشاد ہوا ہے کہ

یا ایہا الذین آمنوا استجیبوا اللہ وللرسول اذا دعاکم لما یحییکم (انفال ع ۳)

اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کی دعوت کو بہ گوش ہوش قبول کرو جب رسولِ خدا تمھیں اس امر کی جانب دعوت دیتے ہیں جو تم میں نئی روح پھونکتا ہے،

تو شیخ واسطی نے اس کی شرح میں لکھا ہے کہ زندگی سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنے کو تمام علائق سے لفظاً و عملاً ہر طرح آزاد کرلے، اور بعض صوفیہ اس کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ

استجیبوا اللہ بسرائرکم وللرسول بظواہرکم فحیاۃ النفوس بمتابعۃ الرسول صلعم و حیاۃ القلوب بمشاھدۃ الغیوب وھو الحیاء من اللہ تعالیٰ برویۃ التقصیر (صـ۲۳)

اللہ کی دعوت قبول کرو اپنے باطن سے اور رسول کی دعوت اپنے ظاہر سے، اس لئے کہ نفوس کی حیات عبارت ہے، پیروی رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اور قلوب کی حیات عبارت ہو مشاہدہ غیب سے جس کے معنی یہ ہیں کہ گناہ کے مواجہہ میں حق تعالیٰ سے شرم کی جائے،

ان مقدمات سے صرف ایک ہی نتیجہ نکل سکتا تھا اور وہی شیخؒ نے نکالا ہو، یعنی تصوف نام ہے قولاً، فعلاً، حالاً ہر حیثیت سے اتباع رسول صلی صلی اللہ علیہ وسلم کا (صـ۲۶) اور اسی پر مداومت سے جب اہل تصوف کے نفوس مقدس

ہو جاتے ہیں، حجابات اُٹھ جاتے ہیں، اور ہر شے میں اتباع رسول ہونے لگتا ہے، تو اب حق تعالیٰ اُن سے محبت کرنے لگتا ہے، اس لئے کہ وعدہ الٰہی موجود ہے،

قل ان کنتم تحبون اللّٰہ فاتبعونی یحببکم اللّٰہ	کہ اے پیغمبر آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا،

پیروئی رسولؐ عین محبت الٰہی کی علامت ہے اور پیروی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا صلہ بھی محبت الٰہی قرار دیا گیا ہے،

فاوفر الناس حظا من متابعۃ الرسول اوفرھم حظا من محبۃ اللّٰہ تعالیٰ والصوفیۃ من بین طوائف الاسلام ظفروا بحسن المتابعۃ (ص۲۶)	بس جو شخص جتنا زیادہ تبع رسولؐ ہے، اسی قدر زیادہ وہ محبت الٰہی کا بھی حصہ دار ہے، اور صوفیہ ہی نے اسلامی گروہوں میں سب سے بڑھ کر اتباع رسولؐ کیا ہے،

حیات نبوی کے جتنے بھی شعبے ممکن ہیں، اُن سب میں صوفیہ ہی نے سب سے بڑھ کر اتباع سنت نبوی کا حق ادا کیا ہے، مثلاً اعمال نبوی میں کثرت عبادات و قیام تہجد و نوافل صوم وصلوٰۃ کا اور اخلاق نبوی میں عفو و حلم و رافت و رحمت و حیاء و تواضع کا اور اقوال نبوی میں مدارات و نصیحت کا اور احوال نبوی میں زہد و توکل و صبر و رضا و خشیت و ہیبت کا، تو گویا گروہ صوفیہ۔

فاستوفوا جمیع اقسام المتابعۃ واحیوا السنۃ باقصی الغایات (ص۲۷)	نام ہے اس گروہ کا جس نے ہر قسم کی پیروئی رسول کا حق ادا کر دیا اور سنت رسولؐ کو انتہائی درجہ تک زندہ کر دیا۔

پس یہی گروہ صوفیہ صافیہ درحقیقت اس بشارت عظیم کا بھی اہل ہے، جو حدیث نبوی میں وارد ہوئی ہے کہ،

من احیاء سنتی احیانی ومن احیانی کان معی فی الجنۃ

جس نے میرے طریقہ کو زندہ کیا اس نے مجھے زندہ کردیا، اور جس نے مجھے زندہ کردیا، وہ میرے ہمراہ جنت میں ہوگا،

شیخ عبدالواحد بن زیدؒ صوفیۂ قدیم کے ایک مسلّم سرخیل ہوئے ہیں، ان سے لوگوں نے صوفی کی تعریف دریافت کی تو انھوں نے کہا، کہ

قال القائمون بعقولهم علی فهم السنة والعاکفون علیها بقلوبهم والمعتصمون بسیدهم من شر نفوسهم هم الصوفیة

جو لوگ سنت رسول پر اپنی عقل کو صرف کرتے ہیں، اور اپنے قلب سے متوجہ رہتے ہیں، اور اپنے نفس کی خباثت سے اپنے سرور وسردار کے دامن میں پناہ لیتے ہیں، وہی صوفیہ ہیں۔

شیخ سہروردیؒ اس تعریف کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ

هذا وصف تام وصفهم به

یہ انکی بہترین تعریف ہے جو کی گئی،

آج سوال صرف اتنا ہے کہ ہمارے مشائخ اور پیرزادوں اور سجادہ نشینوں میں سے کتنوں پر یہ تعریف صادق آتی ہے؟ اور جو فقر و درویشی کے مدعی، پیروی سنت و شریعت کو اپنے مرتبہ سے پست و فروتر سمجھتے ہیں، ایسے ظالموں، نا انصافوں پر، صوفی، کا اطلاق کسی درجہ میں بھی درست ہو سکتا ہے؟

آپ پیر و مرشد بن جانے کی بڑی سند یہ ہے کہ یہ پیر صاحب فلاں بزرگ کی اولاد میں ہیں، مخدوم زادہ ہیں، خواجہ زادہ ہیں، ولی زادہ ہیں، لیکن قدیم اکابر طریقت اس "نسبی" دلیل اور اس کے مفہوم سے بیگانہ تھے، ان کا فرمانا

یہ تھا کہ :-

ومرتبۃ المشیخۃ من اعلی الرتب فی طریقۃ الصوفیۃ ونیابۃ النبوۃ فی الدعاء الی اللہ (ص ۴۵)

شیخ ہونے کا مرتبہ تو طریق تصوف میں ایک اعلیٰ مرتبہ ہے، اور شیخ دعوت الی اللہ میں پیمبر کا نائب ہوتا ہے،

استحقاق کا معیار بجائے بزرگ زادگی کے اپنی ذاتی پیروی راہ حق اور اتباع سالک خیر تھا۔

وکثیراً کان شیخنا شیخ الاسلام ابوالنجیب یقول ولدی من سلک طریقی واہتدی بھدی (ص ۴۵)

ہمارے شیخ شیخ الاسلام ابوالنجیب سہروردی اکثر فرمایا کرتے تھے کہ میرا فرزند وہی ہے جو میرے طریقہ پر چلے اور میری راہ ہدایت اختیار کرے،

پھر شیخ ہو جانے کے بعد مرتبۂ کمال کا معیار بھی وہی اتباع و اقتدائے رسول ہے اگر شیخ کی یہ نسبت اقتداء و اتباع درست ہے، تو حسب وعدۂ قرآنی وہ اللہ کی نظر میں محبوب ہو گا، (ص ۴۵)

آج بہت سے "بزرگوار" اپنے کو "ملامتی" اور "قلندری" اور "رسول شاہی" مشہور کئے ہوئے فرائض شرعی کو اپنے سے ساقط سمجھے ہوئے ہیں، ارتکاب منہیات میں جری ہیں، اور اپنی وضع قطع، اخلاق و معاشرت، قول و فعل سے الٹے احکام شریعت کی تحقیر ہی کیا کرتے ہیں ___ ملامتیہ اور قلندریہ تاریخ تصوف کے کوئی نو پیدا فرقے نہیں، ان کا وجود شیخ کے زمانہ میں بھی تھا بلکہ شیخ تو نفس طریق ملامتیہ کی عظمت کے پوری طرح قائل ہیں، لیکن اس طریق کی تشریح بھی تو ان کی زبان سے سنئے :-

انه حال شریف و مقام
عزیز و تمسک بالسنن
والآثار و تحقق بالاخلاص
(ص۳۱)

یہ ایک معزز حال ہے، اور بلند مقام
ہے، یہ سنت نبوی و آثار صحابہ سے
تمسک اور مرتبۂ اخلاص کے تحقق کا
نام ہے،

ملا جامیؒ بہت بعد کے شخص ہیں، بہتر ہوگا کہ اس متن کی شرح ان کی زبان سے بھی ملاحظہ کرتے چلیے:-

واما ملامتیه جماعتے باشند که در رعایت
معنی اخلاص و محافظت قاعدهٔ
صدق و اختصاص غایت جهد
مبذول دارند و در اخفائے
طاعات و کتم خیرات از نظر خلق
مبالغت واجب دانند تا آنکه
هیچ دقیقه از صوالح اعمال مهمل
نگذارند و تمسک به جمیع فرائض
و نوافل از لوازم شمرند و مشرب
ایشاں در کل اوقات تحقیق معنی
اخلاص بود، و لذت شاں در
تفرد نظر حق به اعمال و احوال
ایشاں و همچناں که عاصی از ظهور
معصیت بر عذر بود ایشاں
از ظهور طاعت که مظنهٔ ریا باشد

ملامتیہ اس فرقہ کو کہتے ہیں جنکی انتہائی
کوشش مرتبۂ صدق و اخلاص کے
برقرار رکھنے کی ہوتی ہے (کہ ریا و
نمایش کی ہوا بھی اعمال و طاعات
میں نہ لگنے پائے) اور وہ طاعات
و حسنات کو نظر خلائق سے مخفی رکھنے
میں انتہائی کوشش کرڈالتے ہیں،
درآنحالیکہ کوئی جز بھی وہ اعمال
صالح میں سے نہیں چھوڑتے ہیں،
اور سارے فرائض اور نوافل کے
بجالانے کا انتہائی اہتمام رکھتے ہیں
اور ان کا مسلک یہ ہے کہ ہر وقت
حسن اخلاص کے تحقق میں لگے رہتے
ہیں، اور انھیں لذت اسی میں
آتی ہے کہ ان کے اعمال و احوال

حذر کنند تا قاعدۂ اخلاص خلل نہ پذیرد، (نفحات الانس ص ۹۰۸ طبع کلکتہ)

پر صرف خالق کی نظر رہے اور وہ اپنی طاعت کو نظر خلائق سے چھپانے میں ایسا ہی اہتمام رکھتے ہیں جیسا دوسرے لوگ اپنی معصیت کو چھپانے میں کہ کہیں اخلاص کامل میں دھبہ نہ لگ جائے اور شائبۂ ریا نہ شامل ہوجائے۔

معاذ اللہ! کہاں یہ اخلاص مجسم اور پیکر طاعت و تقویٰ گروہ اور کہاں ترک احکام شریعت کا انتساب! ——— "کتنا غلط یہ حرف بھی مشہور ہوگیا،

لیکن بہروپیوں، ریاکاروں، سوانگ بھرنے والوں کی دنیا کچھ آج سے نہیں، شیخ ہی کے زمانہ سے آباد ہے،

فمن ذلک قوم یسمون نفوسھم قلندریۃ تارۃً وملامیۃ اُخری (ص ۱۲)

یہ لوگ کبھی اپنے کو قلندریہ اور کبھی ملامتیہ مشہور کرتے ہیں،

اس کے بعد شیخ نے ملامتیہ، قلندریہ اور صوفیہ کے حدود الگ الگ ظاہر کرکے پھر آگے لکھا ہے کہ

"گمراہوں کے ایک گروہ نے اپنے کو ملامتیہ مشہور کر رکھا ہے، اور صوفیہ کا لباس پہن رکھا ہے، تاکہ اس کا بھی شمار صوفیوں میں ہو، حالانکہ انھیں کوئی لگاؤ بھی صوفیہ سے نہیں، بلکہ یہ لوگ دھوکے اور گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں، اور صوفیوں کا لباس کبھی اپنے کو بچانے کے لئے اور کبھی کسی دوسرے دعویٰ کے ساتھ پہنتے ہیں،

اور اہل اباحت کی راہ چلتے ہیں، اس زعم میں پڑے ہوئے ہیں کہ انکے ضمیر اللہ کی جانب راجع اور خالص ہو گئے ہیں، اور کہتے ہیں کہ یہی کامیابی مقصود ہے، اور یہ کہ شریعت کی پابندیاں تو عوام کے لئے ہیں، جن کی عقلیں کوتاہ ہیں اور جو تقلید واقتداء کے پھندے میں پھنسے ہوئے ہیں۔

یہ عین الحاد اور زندقہ اور جہل ہے، یہ فریب میں پڑا ہوا گروہ اس حقیقت سے جاہل ہے کہ شریعت نام ہے حق عبودیت کا، اور حقیقت عبودیت ہی ہے، اور جو شخص اہل حقیقت سے آگاہ ہوگا، وہ حق عبودیت اور حقیقت عبودیت میں مقید ہوگا، (ص۲۳)

ایسے ہی بدینوں کے باب میں حضرت عمر فاروق رضؓ کا یہ قول فیصل موجود ہے کہ

ان اناساً کانو ایوخذون	عہد رسالت میں تو لوگوں سے مواخذہ
بالوحی علی عہد رسول اللہ	وحی کی بناء پر کیا جاسکتا تھا لیکن
صلی اللہ علیہ وسلم وان الوحی	اب جبکہ سلسلہ وحی منقطع ہو چکا ہے،
قد انقطع وانما ناخذ کم	اب ہم تم سے مواخذہ تمھارے
الآن بما ظہر من اعمالکم	اعمال ہی کی بناء پر کریں گے، بس
فمن اظہر لنا خیراً امناہ	جس کے اعمال خیر ہم پر ظاہر ہونگے
وقربناہ ولیس الینا من	ہم اسے قبول کریں گے اور اس سے
سریرۃ شئ اللہ تعالیٰ یحاسبہ	قربت کریں گے، ہیں اس کے باطن
فی سریرتہ ومن اظہر لنا	سے کچھ غرض نہیں، اسکے باطن کا
سوی ذالک لم نامنہ وان	حساب کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے،
قال سریرتی حسنۃ	لیکن اگر اس کے اعمال ذخیر کے

لے زندیقوں کا وہ گروہ جو عملاً کسی چیز کے حرام ہونے کا قائل نہیں۔

علاوہ) دوسری صورت میں ہم پر
ظاہر ہوئے، تو ہم اُسے قبول نہیں
کرنے کے خواہ وہ کہتا رہے کہ میرا
باطن آراستہ ہے،

فاروق اعظمؓ ہی کا ایک دوسرا ارشاد بھی ہماری رہبری و رہنمائی کیلئے موجود ہے،

فاذا رأینا متہاونا بحدود	جب ہم کسی کو دیکھیں گے حدود شرع
الشرع محمدؐ للصلوٰت	کی طرف سے غیر متوجہ، اور نماز فرض
المفروضات لایعتد بحلاوۃ	کو چھوڑے ہوئے، اور یہ کہ وہ
التلاوۃ والصوم والصلوٰۃ	تلاوت قرآن اور روزہ اور نماز
ویدخل فی المداخل المکروھۃ	سے لذت نہیں پاتا اور وہ حرام و
المحرمۃ نرورۃ ولا تقلبہ	مکروہ مقامات میں در آتا ہے تو
ولا تقبل دعوالا ان لہ	ہم اس سے انکار کریں گے اور اس
سریرۃ صالحۃ	دعوی کو قبول کریں گے کہ وہ باطن
	تو صالح رکھتا ہے،

جنید بغدادیؒ ایک مرتبہ معرفت الٰہی پر گفتگو کر رہے تھے، ایک شخص نے سوال کیا کہ آیا اہل معرفت ترک اعمال صالحہ کے مقام تک بھی پہونچ سکتے ہیں؟ حضرت جنیدؒ نے طیش و برہمی کے ساتھ ارشاد فرمایا،

ان ھذا قول قوم تکلموا	یہ اُس گروہ کا قول ہے جو ترک اعمال
باسقاط الاعمال و	کا قائل ہے میرے نزدیک یہ بہت
عندی عظیمۃ والذی	بڑی (بے باکی ہے) اور جو چوری
یسرق ویزنی احسن حالاً	کرتا ہے اور زنا کرتا ہے، اس کا

من الذی یقول ھذا وان	بھی حال اس قول کے اختیار کرنے
العارفین باللہ اخذوا	والے سے بہتر ہے، عارفوں نے اپنے
الاعمال من اللہ والیہ	اعمال اللہ تعالیٰ سے حاصل کئے
یرجعون فیھا ولو بقیت	ہیں، اور ان ہی اعمال کیساتھ وہ
الف عام لم انقص من	اسکی جانب واپس ہوں گے، میری
اعمال البر ذرۃ الا ان	عمر تو اگر ایک ہزار سال کی ہو جب بھی
تحال بی دونھا وانھا لا	میں ان اعمال خیر سے ایک ذرہ کم
کد فی معرفتی واقوی لحالی	نہ کروں بجز اس کے کہ کوئی میرے
	اور ان کے درمیان حائل ہو جائے
	اور یہ اعمال تو میری معرفت کے لئے
	موکد اور میرے حال کیلئے موجب
	تقویت ہیں،

اور ان جنیدؒ کا "سید الطائفہ" ہونا مسلم ہے،

لیجئے شیخ نے خود اپنے علاوہ سند اپنے سید کی اور اُن سید کے بھی سید عمر فاروقؓ کی پیش کر دی، اب اس کے بعد بھی کوئی اور درجہ باقی رہ جاتا ہے؟

(۶) فوائد الفواد[1]

خواجہ نظام الدین اولیاء سلطان المشائخ

(الف) مصنف

اب تک جن بزرگوں اور ان کی تعلیمات وہدایت سے تعارف ہوا وہ سب ہندوستان سے باہر کے تھے، اور اکثر کی سکونت بھی باہر ہی رہی۔ اب ایک ایسے بزرگ کے درس وہدایات کا سامنا ہے جو ہندوستان ہی کی خاک سے اُٹھے، اور اسی سرزمین میں اپنی ساری زندگی گذاری، اور اتفاق سے زمانہ بھی وہ پایا، جب ہندوستان کا اسلام ہندویت اور ہندیت سے اچھا خاصہ متاثر ہو چکا تھا، اور مسلمانوں کو یہاں رہتے سہتے کئی صدیاں گذر چکی تھیں،

چھٹی ہجری میں بخارا سے دو سیّد زادے سید علی اور سیّد عرب ہندوستان وارد ہوئے۔ قیام پہلے لاہور میں کیا، پھر آج کل کے اتر پردیش کے شہر بدایوں

---

[1] ماخذ:۔ (۱) سیر الاولیاء (میر خورد دہلوی)
(۲) راحت القلوب (ملفوظات خواجہ فریدؒ مرتبہٗ خواجہ نظام)
(۳) فوائد الفواد (ملفوظات خواجہ نظامؒ مرتبہ میر حسن سجزی)
(۴) راحۃ المحبین (" " مرتبہ امیر خسروؒ)
(۵) افضل الفوائد (" " " " " ")
(۶) درر نظامی (ملفوظات خواجہؒ نظامؒ مرتبہ شیخ علی محمود جاندار) قلمی
(۷) تاریخ فیروز شاہی (ضیاء برنی)
(۸) اخبار الاخیار (شیخ عبد الحق دہلوی)
(۹) نفحات الانس (ملا جامیؒ)

میں، اور یہیں مستقل سکونت اختیار کرلی، بدایوں اُس وقت عالموں اور درویشوں کا شہر تھا، اور اس مناسبت سے قبۃ الاسلام کہلاتا تھا، ایک کے صاحبزادہ سید احمد کا عقد دوسرے کی صاحبزادی بی بی زلیخا کے ساتھ ہوا، اور اس عقد کا ثمر، اُس ہستی کے قالب میں ظاہر ہوا، جس پر خاک بدایوں ہی کو نہیں خاکِ ہند کو ناز ہے۔ ولادت، ۲۷ صفر ۶۳۶ھ کو ہوئی، والدین نے نام فخرِ کائناتؐ کے اسم مبارک پر محمد رکھا، شہرتِ عام نے نظام الدین اولیا، کہہ کر پکارا، اولیائے معاصرین کی زبانیں نظام الاولیا، نظام الحق والدین، سلطان المشائخ اور محبوب الٰہی کے القاب پر کھلیں۔

شجرۂ نسب پدری و مادری دونوں سلسلوں سے بہ واسطہ سیدنا حضرت حسینؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ تک پہونچتا ہے، عمر کا پانچواں سال تھا کہ سایۂ پدری سر سے اٹھ گیا اور عرب کے یتیم کی اُمت کا یہ گوہر بے بہا بھی یتیم رہ گیا، والد ماجد حضرت سید احمد ایک متقی و مقدس بزرگ تھے (مزار بدایوں میں اس وقت تک زیارت گاہ خلائق ہے) تربیت کی ذمہ داری والدہ ماجدہ بی بی زلیخا پر پڑی، یہ اپنے زہد و تقویٰ کے لحاظ سے اپنے وقت کی رابعہ بصریہ تھیں، مزار نواح دہلی میں اب بھی عقیدتمندوں کا مرجع ہے۔

تذکروں میں ہے کہ صاحب نسبت و مستجاب الدعوات تھیں، دعاؤں کے تیر ہدف مراد تک پہونچ کر رہتے۔ کشف تکوینی بھی حاصل تھا، آئندہ واقعات بارہا مکشوف ہو جاتے۔ آخری مرض میں جب مبتلا ہوئیں تو کھانا پانی سب چھوڑ دیا۔ ہر وقت گریہ طاری رہتا۔ جمادی الاولیٰ کی آخری تاریخ کی شام تھی، نیا چاند دیکھ کر صاحبزادہ حب دستور سلام کے لئے والدہ ماجدہ کی خدمت میں حاضر ہوئے فرمایا، بیٹے اگلے مہینے کس کے سلام کو آؤگے، اور کون دعائیں دے گا۔

لخت جگر کو معلوم ہو گیا سر سے یہ سایہ بھی اٹھا چاہتا ہے، رو کر عرض کی کہ "اماں جان ہم کو کس پر چھوڑے جاتی ہو؟" فرمایا کہ "اس کا جواب صبح کو لینا، اس وقت جا کر شیخ نجیب الدین متوکل کے ہاں سو رہو۔" رات میں نیند کسے آتی، صبح سویرے گھر کی خادمہ دوڑی ہوئی پہونچی، کہ فوراً بلایا ہے، دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ حاضر خدمت ہوئے، ماں نے پوچھا "بیٹا رات کو خوش رہے تھے" رو کر اور قدموں پر گر کر عرض کی کہ "اماں جان میری خوشی تو آپ کی سلامتی کیساتھ ہے۔" فرمایا "اب وقت ہے کہ کل کی بات کا جواب لو۔" یہ کہہ کر ان کا داہنا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا، اور آسمان کی طرف منھ کر کے کہا پروردگار، اس دکھیارے بیکس کو تیرے سپرد کرتی ہوں۔" یہ کہا اور روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

اللہ کو سونپا ہوا بچہ، بیکس و لاوارث نہیں رہ سکتا تھا۔ ذہانت، ذکاوت، فہم صحیح، شوق علم، حافظہ، یہ سب خداداد نعمتیں بچپن سے موجود تھیں، حفظ قرآن مجید کے بعد دوسرے علوم شروع کئے، اور اکثر میں پوری دستگاہ بہم پہونچائی، بدایوں خود ہی کاملین فن کا مرکز تھا، مزید ذوق علم کی کشش یہاں سے دہلی لائی، اور یہاں باقی علوم کی بھی تکمیل ہو گئی، دستار بندی بدایوں میں ہو چکی تھی، دہلی میں آ کر فقہ و حدیث کی بھی باضابطہ سند و اجازت حاصل ہوئی، علوم و فنون میں بحث و گفتگو کا بڑھا ہوا شوق دیکھا طلبہ و علماء کے حلقہ میں نام نظام الدین بحاث پڑ گیا،

ادھر علوم ظاہری میں یہ انہماک جاری تھا، ادھر فطرت ملکہ انکو ایک دوسری ہی زندگی کے لئے تیار کر رہی تھی، قیام ابھی بدایوں ہی میں تھا، اور سن بھی ۱۲ سال کے اندر ہی کہ ایک قوال کی زبان سے حضرت خواجہ فرید گنج شکرؒ کے وہ کمالات سننے میں آئے، کہ دل غائبانہ عقیدت کا مسکن ہو گیا، یہاں تک کہ ہر نماز کے

بعد بابا فرید کا ورد شروع ہو گیا تھا، دہلی آتے ہوئے راستہ میں حضرت موصوف کے اور بھی تذکرے سنے، اشتیاق بڑھا، دہلی پہونچے تو پڑوس میں شیخ نجیب الدین متوکل کا ملا، وہ خود حضرت فریدؒ کے خلیفہ اور عزیز خاص تھے، آپ کے ذریعہ سے جو حالات و کمالات سنے، انھوں نے شوق عقیدت کی آگ کو اور تیز کر دیا، یہاں تک کہ ایک روز جامع مسجد دہلی میں ایک خوش لحن قاری کی زبان سے آیۂ کریمہ

الم یان للذین آمنوا ان تخشع	کیا ابھی ایمان والوں کیلئے وقت نہیں
قلوبھم بذکر اللّٰہ	آیا کہ انکے قلب ذکر الٰہی کے آگے جھک جائیں

سن کر دل بے چین ہو گیا، اور جی میں ٹھن گئی کہ ترک علائق کر کے مرید ہو جا۔

لوگوں نے مشورہ شیخ نجیب الدین سے بیعت ہو جانے کا دیا، مگر خود شیخ نے فرمایا کہ مرید ہونا ہے تو وقت کے دو بزرگوں میں کسی سے بیعت ہو جاؤ، ایک حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ، دوسرے حضرت بابا فرید اجودھنی، دوسرے ہی دن آپ دہلی سے چل کھڑے ہوئے، لیکن دل اب بھی ذرا متردد تھا کہ راستہ اجودھن اور ملتان میں سے کہاں کا اختیار کیا جائے۔ آخر ایک شب سرور کائنات صلی اللہ علیہ سلم کی زیارت نصیب ہوئی، اور حکم ملا کہ "اجودھن کا راستہ اختیار کرو" عمر کے بیسویں سال اس سفر کی آخری منزل ختم ہوئی بعد ظہر خواجہ فریدؒ کی خدمت میں حاضری ہوئی۔ جذبہ اشتیاق ادھر سے بھی زوروں پر تھا۔ سلام میں خود ہی کیفیت فرمائی گئی اور نظر پڑتے ہی یہ شعر زبان مبارک پر آیا ؎

لے آتش فراقت دلہا کباب کردہ   سیلاب اشتیاقت جانہا خراب کردہ

بیعت کے ساتھ خلعت خلافت بھی مرحمت ہوئی، اور ارشاد ہوا کہ نظام الدین میں تو ولایت ہندستان کسی اور کو دینا چاہتا تھا کہ غیب سے ندا آئی کہ انتظار کرو، نظام بدایونی آرہا ہے، اور وہی اس ولایت کے لائق ہے۔"

مرشد کی خدمت میں ایک عرصہ تک سرگرم رہنے کے بعد حسب الحکم دہلی واپس ہوئے، اور مجاہدوں اور ریاضتوں میں مصروف ہو گئے، اخفائے حال کا اسقدر اہتمام تھا کہ جہاں ایک جگہ قیام فرمانے کے بعد لوگوں کو بزرگی کا کچھ پتہ چل پایا، مکان تبدیل کر دیتے اور کسی دوسرے محلہ میں اٹھ جاتے۔ بالآخر جب خلقت کا ہجوم زیادہ رہنے لگا، تو اشارۂ غیب پاکر شہر سے باہر جنوب میں غیاث پور میں سکونت اختیار فرمائی، اور یہیں آخر عمر تک قیام رہا، یہ وہی مقام ہے جو اب بستی نظام الدین اولیاء کہلاتا ہے،

ابتدائی زمانہ پیر و مرشد کی سنت میں بڑی تنگی و تنگدستی کا گذرا، شروع میں کئی سال تک یہ حال رہا کہ مسلسل کئی کئی دن تک کوئی آمدنی کہیں سے نہ ہوتی اور فقر و فاقہ کی نوبت رہتی، چند سال بعد مرشد کی دعا سے یا (جیسا کہ دوسری روایتوں میں ہے) کسی مجذوب کی توجہ کی برکت سے اس کے برعکس فارغ البالی پیدا ہوئی، اور وہ بھی اس قوت سے کہ اچھے اچھے رئیسوں کو رشک آنے لگا، باورچی خانہ دن رات گرم رہتا تھا، لنگر ہر وقت جاری تھا، مہمان خانہ مہمانوں کے ہجوم سے پُر رہتا تھا، اور مہمانداری کا خرچ کئی ہزار ماہوار کا تھا، اس امارت و ریاست کے ساتھ اس درویش کی اپنی یہ حالت تھی کہ سال کے سال برابر روزہ رہا کرتے تھے، اور افطار و سحر کے وقت، موٹے قسم کی غذا اور وہ بھی قلیل مقدار میں تناول فرماتے تھے، غرض یہ کہ یہ "نوش خوری" اور طباخی وغیرہ کے جتنے بھی انتظامات تھے، وہ دوسروں کے لئے تھے۔ اپنی ذات کے لئے اصلا نہیں۔ خادموں کو تاکید تھی کہ جو کچھ آتا رہے روزانہ سب نکلتا بھی رہے، اور جمع مطلق نہ ہونے پائے، جمعہ کے دن اس کا اہتمام اور زیادہ ہو جاتا تھا اور جب تک توشہ خانہ مال اور غلہ سے بالکل صاف نہ کرا دیا جاتا، نماز جمعہ کے لئے تشریف نہ لیجاتے۔

نکاح کی نوبت نہیں آئی، ساری عمر تجرد میں گذری، ایک بہن تھیں، ان کی اولاد کا سلسلۂ نسل بحمد اللہ جاری ہے، اور خاندان کا سلسلۂ نسل اسی ذریعہ سے قائم ہے،

خلق کا رجوع تذکرہ نویسوں کا بیان ہے کہ بڑی ہی کثرت سے رہا، عوام درویش، امراء، وزراء، سب ہی اس شمع کے پروانے تھے، لیکن آپ کے استغنار کا یہ عالم تھا کہ خود کسی امیر و وزیر کے ہاں تشریف نہیں لے گئے، شکایتیں دربار شاہی تک پہونچیں اور فرمان سلطانی پہونچا کہ کبھی کبھی دربار میں حاضری ہوتی رہے، لیکن تعمیل ایسے فرمان کی کبھی نہیں کی گئی، اس طرز عمل سے بارہا عتاب سلطانی کی نوبت آئی، بلکہ کبھی کبھی سخت خطرے بھی پیش آگئے، لیکن جو گردن صرف رب الارباب کے آگے جھکنے کے لئے خلق ہوئی تھی، وہ کبھی کسی گردن کش سلطان و فرماں روا یا امیر و وزیر کے آگے نہ جھک سکی۔ دہلی کے تخت پر جب قطب الدین مبارک شاہ بیٹھا (۷۱۶ھ / ۱۳۱۶ء) تو روایت ہے کہ وہ حاسدوں اور در اندازوں کے کہنے سنے میں آکر حضرت شیخ سے عناد رکھنے لگا، پہلے قسم قسم کی سختیاں کیں، اس کے بعد اس پر اصرار کیا، کہ اگر ہر ہفتہ نہیں تو اقل مرتبہ ہر مہینہ چاندرات کو دوسرے مشایخ وقت کی طرح شیخ بھی ضرور ایوان شاہی میں حاضر ہوا کریں، معتقدوں اور مریدوں نے معاملہ کی نزاکت اور غضب سلطانی کی اہمیت کا اندازہ کرکے بہ منت و الحاح عرض کی کہ کم سے کم ایک مرتبہ تو بادشاہ کی خوشی پوری کر دی جائے۔ یہاں تک کہ شوال کا مہینہ ختم ہوا اور ذیقعدہ کی چاندرات آگئی، لیکن عین اسی شب میں بادشاہ کے منظور نظر غلام خسرو خاں نے اپنے خنجر سے بادشاہ ہی کا کام تمام کر دیا۔

ہجوم خلائق سے یہ نہ ہوتا کہ کبھی ذکر و شغل میں فرق پڑ جائے، ساری مبار

رات عبادت اور ریاضت کی نذر ہو جاتی، جب حجرہ کا دروازہ کھلتا تو دیکھنے والے دیکھتے، کہ شب بیداری سے ایک عجب قسم کی روحانی و نورانی مستی چہرہ پر پیدا ہو گئی ہے! ——— مرید خاص و مخلص با اختصاص امیر خسروؒ کا یہ شعر ایسے ہی کسی مرقع کی منظر کشی کر رہا ہے ؎

تو شبانہ می نمائی بہ برکہ بودی امشب
کہ ہنوز چشم مستت اثر خمار دارد

عمر شریف اسی سے اوپر ہو چکی تھی، اس سن پر بھی وہی صوم مسلسل کا معمول جاری رہا،

شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ کے الفاظ ہیں

حق تعالیٰ اور اقبولے تام داد و خاص و عام رالبوے رجوع شد و ابواب فتوح بروے مفتوح گشت و عالمے از موائد احسان و انعام او تمتع گرفتند و او خود بریاضت و مجاہدہ می بود، گویند کہ او در آخر عمر کہ سن شریفش از ہشتاد متجاوز شدہ بود بغایت مجاہدہ پیش گرفتہ بود و صوم دوام داشتے، و بر وقت افطار اندک چیزے بخورے، و طعامیکہ وقت سحر بودے اکثر چناں بودے کہ نخوردے، خادم عرضہ داشت

حق تعالیٰ نے آپکو نہایت مقبول بنا دیا، اور خاص و عام سب کا رجوع آپ کی طرف ہو گیا، آپ پر فتوحات کا دروازہ کھل گیا، اور ایک عالم آپ کی مہمان نوازی اور عنایتوں سے سیراب ہونے لگا لیکن آپ خود برابر ریاضت و مجاہدہ میں لگے رہے، یہانتک کہ آخر عمر میں جب سن شریف اسی سے متجاوز ہو چکا تھا، آپ انتہائی مجاہدوں میں مشغول رہتے تھے اور صوم دوام رکھتے تھے، افطار کے وقت بہت قلیل غذا ہوتی اور

کردے کہ مخدوم وقت افطار
طعام کمتر میخوردند اگر از طعام
سحر اندک تناول نہ کنند حال
چہ شود وضعف قوت گیرد،
دریں محل بگریستے و گفتے کہ چندیں
مسکیناں و درویشاں در کنجہائے
مساجد و دوکانہا گرسنہ و فاقہ
زدہ افتادہ اند ایں طعام در
حلق من چگونہ فرو رود وبجہاں
طعام از پیش برمی داشتند"

سحر بھی اکثر ایسا ہوتا کہ نہ کھاتے،
خادم عرض کرتے کہ افطار ہی کے
وقت کیا غذا ہوئی تھی، اگر سحری
بھی چھوٹ گئی تو ضعف ونقاہت
سے کیا حال ہوگا، یہ سنکر مخدوم
رونے لگتے، اور فرماتے کہ بہت
فقیر اور محتاج مسجدوں اور دوکانوں
میں بھوکے اور فاقہ سے پڑے ہیں،
میرے حلق سے نوالہ کیونکر اتر سکتا
ہے یہ فرماتے اور کھانا سامنے سے
ہٹادیتے،

کثرت عبادت کی یہ حالت تھی کہ ساری ساری رات نماز کی نذر ہو جاتی، نماز جماعت کا یہ اہتمام تھا کہ ۸۵ - ۹۰ سال کی عمر میں ضعف ولاغری کے باوجود بالاخانے سے شریک جماعت ہونے کے لئے اتر کر نیچے تشریف لاتے، کثرت صوم کا یہ عالم تھا کہ عمر گویا روزہ ہی میں گذار دی، پانچ ممنوع دنوں کو چھوڑ کر سال کا سال روزہ ہی میں گذرتا، عمر کی زیادتی کے ساتھ غذا میں کمی فرماتے گئے، یہاں تک کہ ضعیفی کے زمانہ میں خادم جب کھانا پیش کرتے تو آپ کبھی ایک روٹی، کبھی آدھی روٹی یا کوئی بدذائقہ ترکاری (جیسے کریلا) نوش فرمالیتے، اور باقی سب لذیذ ونفیس غذائیں دسترخوان پر بیٹھنے والوں کے آگے پیش کر دیتے، اور انھیں اصرار کر کے کھلاتے ——— خود اپنی حالت گرسنگی اور سیری کی اور خواب وبیداری کی تقریباً ایک ہی سی ہو کر رہ گئی تھی،

معمول یہ تھا کہ دن بھر کے روزہ کے بعد، بعد مغرب بالاخانہ پر تشریف لے جاتے، وہیں مریدوں اور مہمانوں کا مجمع ہوتا، دستر خوان پر رنگ رنگ کی غذائیں، میوے اور شیرینیاں ہوتیں، وہ سب دوسروں کی نذر ہو جاتیں، عشا کی جماعت ادا کرنے کو نیچے تشریف لاتے، اس کے بعد پھر اوپر تشریف لے جاتے، اس وقت باریابی کی اجازت صرف مخصوص مریدوں کو ہوتی، اکثر امیر خسروؔ لطائف و حکایات سناتے، اور حضرت تسبیح پڑھتے رہتے، کچھ دیر بعد یہ تخلیہ کی مجلس بھی برخاست ہو جاتی، خادم خاص خواجہ اقبال پانی چند لوٹوں میں بھر کر رکھ دیتے کہ صبح تک کئی بار طہارت و وضو کی ضرورت ہو جائے گی حضرت اندر سے دروازہ بند کر کے نماز اور ذکر و شغل میں مشغول ہو جاتے، سحری کے وقت ایک دوسرے خادم عبدالرحیم ناشتہ لے کر حاضر ہوتے، آپ دروازہ کھول کر کھانا اکثر واپس فرما دیتے، کبھی برائے نام کچھ نوش فرما لیتے، گریہ کثرت سے طاری رہتا، خادموں نے دوسرے وقتوں کے علاوہ سحری کے وقت بھی گریہ کرتے پایا، بعض خادموں نے دستر خوان پر ادھ چبے نوالے پائے، دریافت سے پتہ چلا کہ جو لقمہ لذیذ معلوم ہوتا ہے، اسے دہن مبارک سے واپس نکال کر رکھ دیا جاتا ——— آج محفل سماع کیلئے حضرتؒ کے نام کی آڑ لینے والوں میں کتنے ان ریاضتوں اور مسلسل عمر بھر کے مجاہدوں میں حضرتؒ کی تقلید کریں گے؟

وفات سے ۴۰ یوم قبل غذا بالکل ترک ہو گئی تھی کھانے کی خوشبو تک گوارا نہ تھی، گریہ و زاری بہت بڑھ گئی تھی، نفل نمازوں میں سجدے بہت کثرت سے کرنے لگے تھے، نماز سے فراغت کے بعد دریافت فرماتے، نماز میں نے پڑھ لی؟ اور جب جواب ملتا کہ پڑھ لی ہے، تو یہ فرما کہ "پڑھ لوں خبر نہیں کہ پھر بھی پڑھونگا یا نہیں" پھر پڑھنے لگ جاتے، جب دنیا سے رخصت ہونے کا وقت، بہت قریب

آگیا، تو اقبال خادم کی طرف اشارہ کرکے سب سے مخاطب ہوکر فرمایا کہ "اس نے کوئی چیز گھر میں باقی رکھی تو قیامت کے دن اس کی ذمہ داری اس کے اوپر ہے۔" خادم نے تھوڑی دیر بعد عرض کیا کہ "کچھ غلہ درویشوں کی خوراک کے لئے رکھ لیا ہے، باقی اور سب کچھ تقسیم کر دیا ہے" ناخوش ہوکر فرمایا کہ "اس کو بھی ابھی لٹا دو اور توشہ خانہ میں جھاڑو پھیر دو۔" تعمیل فوراً ہوئی،

وفات صحیح تر روایت کے مطابق، چہارشنبہ، ۱۸ر ربیع الثانی ۷۲۵ھ، ۵ار دسمبر ۱۳۲۴ء کو ۹۲ سال کی عمر میں طلوع آفتاب کے وقت ہوئی، مقبرہ کے لئے ایک عالیشان عمارت بڑے بڑے اونچے گنبدوں والی، زندگی ہی میں کسی بادشاہ وقت نے (آپ کے معاصر متعدد بادشاہ ہوئے ہیں) یا کسی امیر نے (باختلاف روایت) تعمیر کرادی تھی، مگر اس میں دفن ہونا پسند نہ فرمایا، اس عمارت کو حسب وصیت مسجد بنا دیا گیا" اور اس کے صحن میں تدفین ہوئی، شروع میں تربت خام و غیر نمایاں تھی، پختہ مزار اول بار تیمور کے حکم سے بنا، مشہور یہ ہے کہ وہ یہاں جب فاتحہ پڑھنے آیا تھا تو اسے آپؒ کی تربت کا پتہ چلانے میں بڑی دقت پیش آئی تھی، اب جو اسی صحن مسجد میں مزار کی پختہ عمارت سنگ سفید کی ہے، وہ مختصر ہونے کے باوجود نہایت دلکش اور دل کش ہے، اور بعض اہل کشف کا قول ہے کہ اپنے اندر غیر معمولی کشش اور جاذبیت رکھتی ہے،

مریدوں کی فہرست میں مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ، امیر خسروؒ، میر حسن علاء سنجری، شیخ مبارک گوپاموئی، مولانا فخر الدین زرادیؒ، شیخ شمس الدین یحییٰؒ کے نام خاص طور پر ممتاز ہیں، ایک ضعیف روایت یہ ہے کہ مخدوم شرف الدین بو علی قلندر پانی پتی بھی مرید تھے، خلافت مخدوم نصیر الدین چراغ دہلی کو ملی،

(ب) تصنیف

ہندستان کی دنیائے فقر و تصوف میں ایک خاص شہرت و امتیاز سلسلۂ عالیہ چشتیہ کو حاصل ہے کہ ان خواجگان چشت کے "پنجتن پاک" نے اپنی تعلیمات و ہدایات اپنے ملفوظات کے قالب میں چھوڑی ہیں، مختلف مجلسوں میں جو کلمے ان کی زبان سے نکلتے تھے مریدان باصفا انھیں قلمبند کر لیتے اور مرتب کر کے انہی ملفوظات مبارک کو شائع کر دیتے ——

مرشدوں کے ان ارشادات کو جمع اور مرتب کرنے والے خود اپنی اپنی نوبت پر صاحب ارشاد اور بانئ سلسلہ ثابت ہوئے! اور گو محدثین کی سی "تاریخیت اور سند متصل کا التزام بزم تصوف کی چیز نہیں"، پھر بھی اپنے حدود کے اندر شمع سے شمع اسی طرح روشن ہوتی رہی، اور پشتوں تک چراغ سے چراغ جلتا رہا۔

اکابر خواجگان چشت کے سلسلے کے خاتم حضرت نظام الدینؒ ہی ہیں، ان کا زمانہ ساتویں صدی ہجری کے اواخر اور آٹھویں صدی کے شروع کا ہے، آپ کے ملفوظات جمع کرنے کی سعادت ایک سے زائد مریدان با اخلاص کے حصہ میں آئی، چنانچہ دو الگ ملفوظات امیر خسروؒ نے راحت المحبین اور افضل الفوائد کے نام سے مرتب کئے اور ایک شیخ علی محمود جاندارؒ نے درر نظامی کے نام سے (یہ آخری ملفوظ اس نامہ سیاہ کے علم میں ابھی تک غیر مطبوع ہے[1]) لیکن نظام الاولیاؒ کے تمام ملفوظات میں جو ملفوظ نسبتاً سب سے زیادہ مستند قرار پایا وہ فوائد الفواد کے نام سے شیخ کے مرید با اختصاص میر حسن علاء سنجری کا جمع اور مرتب کیا ہوا ہے،

---

[1] دسمبر سنہ ۱۹۳۲ء میں اس ملفوظ کا قلمی نسخہ معلومات سے لبریز سید علیم الدین مرحوم خادم آستانہ نظامی کے پاس دیکھنے میں آیا تھا اور ان کی عنایت سے اسی وقت اس سے کچھ نوٹ بھی لے لئے گئے تھے۔

اہل دل کے نزدیک یہ کتاب گویا چشتیہ بہشتیہ کے نظام تصوف کا ایک مکمل دستور العمل ہے،

شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں۔

آں کتاب درمیان خلفاء و مریدان شیخ نظام الدین دستور است (اخبار الاخیار) ص ۶۸

یہ کتاب شیخ نظام الدین کے خلفاء و مریدین کے درمیان بطور دستور العمل کے ہے،

اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی لکھتے ہیں،

فوائد الفواد دستور العمل سلوک ست و بہ غایت خوب ہر چند خسرو ہم ملفوظ جمع کردہ، لیکن آنقدر مقبول نیست (ملفوظات شاہ عبدالعزیز ص ۳۲ طبع میرٹھ)

فوائد الفواد نہایت خوب ہے اور فن سلوک کا ایک دستور العمل خسرو نے بھی ملفوظات جمع کئے ہیں، لیکن ان کو یہ درجہ قبول حاصل نہیں،

کتاب فوائد الفواد نہایت معتبر است و آں وقت دستور العمل بود نگر دیگر ملفوظات مشتبہ ست غالب کہ بنا شد (ایضاً ص ۸۱)

کتاب فوائد الفواد ہر طرح معتبر ہے، اور اپنے زمانہ میں دستور العمل رہ چکی ہے، دوسرے ملفوظات بھی ہیں، مگر وہ مشتبہ ہیں،

اور یہ شہادتیں تو خیر بہت بعد کی ہیں، ایک معاصر عارف میر خورد کا اعتراف ملاحظہ ہو:-

امروز آں فوائد الفواد مقبول اہل دلان عالم شدہ است و دستور عاشقاں گشتہ و شرق و

فوائد الفواد اس وقت دنیا کے اہل دل طبقہ میں مقبول ہو چکی ہے اور عاشقان الٰہی کی دستور العمل

غرب عالم گرفتہ (سیر الاولیا) بن چکی ہے، مشرق و مغرب میں
مشہور ہے، امیر خورد دہلوی ص۳۰۸
طبع دہلی)

خود امیر خسرو کی بابت منقول ہے، کہ رشک کے ٹھنڈے سانس کے ساتھ فرمایا کرتے تھے کہ کاش میری تمام تصانیف حسن کے نام سے ہوتیں، اور یہ ایک میرے نام سے! (اخبار الاخیار، ص۹۸ سیر الاولیاء، ص۳۰۸) یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ حسن نے اس ملفوظ کو مرتب کرنے کے بعد خود مرشد کی خدمت میں پیش کیا تھا، اور وہاں سے سند قبول یا پروانۂ پسند مل گیا تھا۔ (خزینۃ الاصفیاء، جلد اول ص۳۴۴)

حاصل ساری گفتگو کا یہ ہے کہ اہل سلوک کے حلقے میں فوائد گویا خود حضرت شیخ ہی کی کتاب ہے اور اس میں جو کچھ درج ہے وہ بس شیخ ہی کی تعلیمات ہیں،

پیش نظر نسخہ، نولکشور پریس لکھنؤ کا مطبوعہ، متوسط تقطیع پر ۲۶۰ صفحہ کا ہے اور پانچ حصوں میں تقسیم ہے،

حصہ اول ص۱ تا ۱۰ اس میں شعبان ۷۰۷ھ تا ذی الحجہ ۷۰۸ھ، ۳۴ مجلسوں کا ذکر ہے،

حصہ دوم ص۱۰ تا ۹۰ اس میں شوال ۷۰۹ھ تا شوال ۷۱۲ھ، ۳۴ مجلسوں کا تذکرہ ہے،

حصہ سوم، ص۹۰ تا ۱۱۳ اس میں ذیقعدہ ۷۱۲ھ تا ذی الحجہ ۷۱۳ھ، ۱۵ مجلسوں کا بیان،

حصہ چہارم، ص۱۱۳ تا ۱۲۱، اس میں محرم ۷۱۳ھ تا رجب ۷۱۹ھ، ۳۸ مجلسوں کے مذاکرے ہیں،

حصۂ پنجم ص ۲۱۸-۲۶۰، اس میں شعبان ۷۱۹ھ تا رجب ۷۳۲ھ، ۲۲ مجالس کے ارشادات جمع ہیں،

اس درمیانی وقفوں کے ساتھ، ۱۵ سال تک پھیلی ہوئی مدت کی کل ۱۷۹ مجلسوں اور صحبتوں کے ارشادات درج ہیں، اور یہ گفتگوئیں شیخ کے ابتدائی زمانہ کی نہیں آخری زمانہ کی ہیں، شروع اُس وقت ہوئی ہیں جب شیخؒ کی عمر ۷۰ سے متجاوز ہو چکی تھی اور ختم اس وقت ہوئی ہیں، جب شیخؒ کی وفات (ربیع الثانی ۷۲۵ھ) کو کل دو ڈھائی سال رہ گئے تھے،

کتاب خیال رہے کہ محض ملفوظ ہے، تقریروں اور لکچروں کا مجموعہ نہیں ارادتمندوں کے مختصر حلقہ میں شیخ کی زبان سے نکلے ہوئے حقائق و معارف، لطائف و نکات ہیں محتسب کی زد سے دور، قاضی شریعت کی گرفت سے باہر، اور پھر وقت اور مقام بھی کون؟ عہد رسالت سے سات سو سال کا بعد، اور وہ وقت جب ہندی اسلام طرح طرح کی عجمی اور ہندی رنگ آمیزیوں کا معجون مرکب بن چکا تھا ——— اس حال میں اور اس ماحول میں خیال تو بیشک یہی قائم ہوتا ہے کہ پروا احکام شریعت کی کچھ بہت زیادہ نہ کی گئی ہوگی، اور عجب نہیں جو اس پرانے دین شریعت کے مقابلہ میں تھوڑے بہت ایک نئے آئین طریقت کی تلقین کی گئی ہو۔

ان شبہات کے ساتھ کتاب کھولئے تو نظر چند ہی سطروں کے بعد اس عبارت پر پڑتی ہے، اور پڑتے ہی جم جاتی ہے، کہ

سخن در تزکیہ افتاد، بر لفظ مبارک راند کہ کمال مرد در چہار چیز می شود قلۃ الطعام و قلۃ الکلام و	ایک روز تزکیہ نفس پر گفتگو تھی ارشاد ہوا کہ کمال ان چار چیزوں سے پیدا ہوتا ہے، کم کھانے سے، کم بولنے سے، کم ملنے

قلۃ الصحبۃ مع الانام وقلۃ المنام (کم) ملنے سے اور کم سونے سے ،

لیجئے۔ نہ یہ ارشاد ہوا کہ "عرس" خوب دھوم دھام سے کیا جائے، نہ یہ کہ باجہ گاجہ کا زور رہو، نہ یہ کہ تربتوں پر چادروں اور مٹھائیوں کا ڈھیر لگادیا جائے، اور نہ یہ کہ مزارات کے غسالہ کو پیا جائے اور آنکھوں سے لگایا جائے، بلکہ سیدھی سادی وہی باتیں بتادیں جو اس سے قبل دنیا کے سب سے بڑے معلم و مرشد (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے اتباع میں دوسرے ہادیان طریقت ہی بتا گئے تھے، یعنی وہی کم خوری کم سخنی، کم آمیزی اور کم خوابی،

جامع ملفوظات نے کتاب کے شروع میں یہ قاعدہ رکھا ہے کہ ہر مجلس میں جب جب اپنی حاضری کا ذکر کیا ہے، تو وقت حاضری بھی بتاتے گئے ہیں، لیکن وقت کی تعیین بجائے گھڑی اور پل کے، نماز کے حساب سے کرتے گئے ہیں، یعنی قبل نماز یا بعد نماز گویا نظام الاولیاء کے نظام اوقات کا محور یا مرکز جو کچھ تھی نماز ہی تھی، بعد کی مجلسوں میں اس تصریح کا التزام، غالباً غیر ضروری سمجھ کر چھوڑ دیا ہے، لیکن ساری مجلسوں میں اتفاق سے اور کبھی کبھی نہیں بلکہ باربار اور کثرت سے جن چیزوں کا ذکر ملتا ہے وہ نماز اور روزہ ہیں، اور نوافل و سنن اور قرآن اور تراویح! اور پھر احترام شریعت و اتباع سنت کی تاکیدیں! فقر و تصوف، شیخ کی نظر میں، نرے وجد و حال، ذوق و کیف کا نام نہ تھا، بلکہ ظاہر و باطن دونوں کی آراستگی کا نام تھا، اس تصریح کے ساتھ کہ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں، جن کا ظاہر آراستہ ہوتا ہے، لیکن باطن خراب اور وہ متعبد کہلاتے ہیں کہ گو طاعت بہت کرتے رہتے ہیں، لیکن دل اُن کا دُنیا ہی میں پھنسا رہتا ہے، اور کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں، جن کا ظاہر خراب ہوتا ہے، اور باطن آراستہ! اور یہ مجذوب کہلاتے ہیں، کہ گو اُن کا دل حق سے اٹکا ہوتا ہے، تاہم یہ عمل سے

محروم ہیں، اور کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے ظاہر و باطن دونوں ہی خراب ہوتے ہیں، اور یہ عوام کالانعام ہوتے ہیں، شیخ فرماتے ہیں کہ ان تین طبقوں کے علاوہ چوتھا طبقہ وہ بعضے را ظاہر و باطن آراستہ ان کا ہوتا ہے جن کا ظاہر و باطن دونوں آراستہ ہوتے ہیں

وطائفہ کہ ہم ظاہر ایشاں آراستہ باشد و ہم باطن آں مشائخ اند (ص ۱۳۴)

جن کے ظاہر و باطن دونوں آراستہ ہوتے ہیں، یہی لوگ مشائخ (نقراد) ہیں

اہل طریق اتنا ہی نہیں کہ عموماً و عادتاً احکام شریعت کے پورے پابند رہتے ہیں بلکہ کسی حال میں بھی فرائض کو ترک نہیں ہونے دیتے، استغراق و تحیر کی ایک منزل ایسی آتی ہے کہ یہاں پہونچ کر اگر تکلیفات شرعی کے ساقط ہونے کا دعویٰ کیا جائے، تو عجب نہیں کہ چل جائے، لیکن نظام الاولیاء کی قوت ایمانی کو اتنی رعایت بھی گوارا نہیں، ایک بار مجلس میں ایسے متحیروں کا ذکر ہوا جو دنیا و مافیہا سے بالکل بے خبر رہتے ہیں، ایک صاحب نے اپنا مشاہدہ عرض کیا کہ فلاں مقام پر میں نے چند متحیروں کو دیکھا جو آسمان کی طرف ٹکٹکی لگائے برابر عالم حیرت میں رہا کرتے تھے، لیکن جب نماز کا وقت آتا تو ہوش میں آ کر نماز پڑھ لیتے تھے، اور اس کے بعد پھر اسی عالم تحیر میں واپس پہونچ جاتے تھے، خواجہ نے اس کی تصدیق فرمائی اور ارشاد ہوا۔

ہمچنیں باشد کہ گفتی، اگرچہ شب و روز متحیر باشند اما نماز ایشاں فوت نشود، از جہت ایں تحیر حکایت شیخ الاسلام حضرت قطب العالم خواجہ قطب الدین بختیار اوشی

بیشک ایسا ہی ہوگا جیسا تم نے بیان کیا، تحیر میں دن رات رہیں لیکن انکی نماز چھوٹنے نہیں پاتی، اس سلسلہ میں شیخ الاسلام حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی کے تحیر کی

فرمود قدس سرہٗ کہ او را ہمچنیں چہار شبانہ روز تحیر بود در وقت نقل (ص ۱۴۴)

حکایت بیان فرمائی کہ وفات کے وقت مسلسل چار شب و روز اُن پر تحیر طاری رہا،

خواجہ قطب الدین بختیارؒ کے وصال کی حکایت عام طور پر مشہور ہے، یعنی محفل سماع برپا تھی، نوبت جب غزل کے اس شعر کی آئی، کہ

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را ہر زماں از غیب جانے دیگر است

تو قطب عالم کی حالت متغیر ہونا شروع ہوئی، جب خانقاہ سے گھر لائے گئے تو مدہوش و متحیر تھے، بس یہی کہے جاتے تھے کہ ہاں اسی شعر کی تکرار کیے جاؤ ـــ آگے کا حال خود شیخ کی زبان سے سنئے :ـ

ہمیں بیت پیش او می گفتند او ہمچناں متحیر می بود، چوں وقت نماز در آمد نماز می گزارد و باز ہمیں بیت بگویانند، حالتے حیرتے پیدا می آمد چہار شبانہ روز ہم بریں حال بود، شب پنجم رحلت نمود (ص ۱۴۴)

اسی شعر کی تکرار برابر انکے سامنے ہو رہی تھی، اور وہ اسی طرح مدہوش تھے، جب نماز کا وقت آتا نماز پڑھ لیتے اور پھر اسی شعر کی تکرار کرانے لگتے، اور حال و حیرت کا عالم ان پر طاری ہو جاتا، چار شب و روز برابر یہ حالت رہی، پانچویں شب کو انتقال فرمایا،

اللہ اللہ! کس درجہ کا اہتمام اتباع شریعت کا تھا، یعنی بیہوشی میں بھی ادائے فرائض کا ہوش! ـــــــ ایک مستی اور مدہوشی اس خواجہ چشت کی تھی کہ اپنے کھانے پینے، سونے جاگنے، اوڑھنے پہننے، زندگی و لوازم حیات زندگی کی طرف سے یکسر مدہوش و بیخبر، لیکن اللہ کے باندھے ہوئے فرض

کے لئے باہوش و باخبر! اور ایک مستی آج کے "مستوں" اور "قلندروں" کی ہے کہ اپنے ہر آرام و آرائش بلکہ لطف و لذت کا ہوش اور صرف اللہ کے باندھے ہوئے فرائض کے باب میں مدہوش و بےخبر!

شیخ جس وقت التفات و شفقت خاص فرماتے اُس وقت بھی تاکید طاعت و عبادت ہی کیا کرتے، جامع ملفوظات کہتے ہیں کہ ۱۵ شعبان ۷۰۷ھ کو جب حضوری نصیب ہوئی تو۔

بندہ را پیش طلبید، فرمود کہ باید کہ مشغول پیوستہ بہ طاعت و عبادت باشی و بہ اوراد و ادعیہ اگرچہ ہم مطالعۂ کتاب مشائخ باشد، مشغول باشی و بیکار نہ باشی (ص ۲۲)

بندہ کو اپنے پاس طلب فرمایا اور ارشاد کیا کہ ہمیشہ طاعت و عبادت میں اوراد و دعاؤں کے ذریعہ سے مشغول رہو، خواہ کتب مشائخ ہی کا مطالعہ ہو، بہرحال مشغول رہو، بیکار نہ رہو،

اسی طرح ۲۹؍ جمادی الآخری ۷۱۳ھ کی مجلس کے تحت میں ذکر ہے، کہ سعادت قدمبوسی حاصل ہوئی، نماز جماعت کے فضائل کا تذکرہ ہوا، بندہ سے ارشاد ہوا کہ نماز باجماعت ہی پڑھنی چاہیئے، بندہ نے عرض کیا کہ مکان کے قریب مسجد تو ضرور ہے، لیکن مکان سے اٹھ کر اگر ہم وہاں جائیں تو گھر پر کوئی کاغذ، کتاب وغیرہ کی حفاظت کے لئے موجود نہیں رہتا، اس لئے مکان ہی پر جماعت کے ساتھ پڑھ لیتے ہیں، ارشاد ہوا کہ جماعت سے ضرور پڑھنا چاہیئے، اور بہتر یہی ہے کہ مسجد میں پڑھی جائے" (ص ۱۰۲) ---

آج کتنے چشتی "مشائخ" کے ہاں نماز ہی سرے سے ضروری ہے! جماعت کی تاکید اور مسجد کی اہمیت کا ذکر ہی کیا!

ایک اور موقع پر حضرت سلطان المشائخ ایک بزرگ کے حوالہ سے فرماتے ہیں کہ اوراد و تسبیح، نماز و روزہ ان سب کی مثال دیگ کے مصالحہ کی ہے، اور دیگ کا گوشت ترک دنیا ہے، سو جس طرح محض نمک اور گھی اور مصالحہ ڈال دینے سے تو وہ نہیں تیار ہو سکتا، جب تک گوشت بھی نہ ملایا جائے، اسی طرح حب دنیا کے ترک کئے بغیر سارے اعمال بے نتیجہ ہیں، لیکن جس طرح گوشت اگر موجود ہے تو سب کچھ موجود ہے، اسی طرح ترک دنیا اگر موجود ہے، تو اہل طریق کے ہاں بجائے خود کافی ہے ——— آج سجادگی اور گدی نشینی کے لئے مقدمہ لڑنے والے پیرزادے اور نذر و نیاز اور چڑھاوے کے تقسیم کے لئے لاٹھیاں چلانے والے، فوجداریاں کر ڈالنے والے مشائخ زادے ایسے ملفوظ کے لئے کیا کہیں گے؟

لیکن خود ترک دنیا کا مفہوم بھی سمجھ لینا چاہئے، ایسا نہ ہو کہ یہ جوگ اور رہبانیت کے مترادف قرار پا جائے، شیخ فرماتے ہیں۔

ترک دنیا آن نیست کہ کسے خود را برہنہ کند مثلاً لنگوٹہ بربندد و بنشیند۔ ترک دنیا آن ست کہ لباس بپوشد و طعام بخورد اما آنچہ میسر رسد روا دارد و بہ جمع او میل نہ کند و خاطر را متعلق چیزے نہ آرد و ترک دنیا ست (ص۹)

ترک دنیا کے معنی یہ نہیں کہ انسان اپنا لباس اتار دے یا لنگوٹہ باندھ لے ترک دنیا کے معنی یہ ہیں کہ انسان لباس بھی پہنے اور کھانا بھی کھائے البتہ جو کماتا رہے، خرچ کرتا رہے، جوڑ جوڑ کر نہ رکھے اور دل کو کسی چیز میں اٹکائے نہ رکھے، یہ ترک دنیا ہے،

ان اوراق میں یہ بار بار آچکا ہے کہ طریقت، شریعت سے جدا نہ رہے

لیکن اس کی مخالفت ذرا سی نہیں، بلکہ شریعت ہی کے مغز یا عطر یا روح کا نام طریقت ہے، فقہاء نے شریعت کے ظاہری پہلو کو لے لیا، اور فقراء نے اپنی نظر باطنی پہلو پر جمائے رکھی، شیخؒ کے ملفوظات میں اس خیال کی تکرار ملتی ہے،

ایک روز شیخ جلال الدین تبریزیؒ کی حکایت بیان فرمائی کہ آپ سیاحی کرتے ہوئے بدایوں وارد ہوئے اور یہاں قیام فرمایا، ایک روز قاضی شہر کے مکان پر ملنے گئے، خدمت گاروں نے کہا کہ ابھی قاضی صاحب نماز میں مشغول ہیں، شیخ نے تبسم کے ساتھ فرمایا، قاضی صاحب نماز پڑھنا جانتے بھی ہیں؟" دوسرے دن قاضی صاحب شیخ کی قیامگاہ پر آئے، اور بولے۔" کل آپ نے یہ کیسے کہہ دیا تھا کہ قاضی نماز پڑھنا جانتے بھی ہیں؟ میں تو مسائل و احکام نماز پر کتابیں لکھ چکا ہوں۔" شیخ نے کہا" عالموں کی نماز دوسری ہوتی ہے، اور فقیروں کی دوسری۔" قاضی صاحب بولے" کیا فقیر کوئی اور قرآن پڑھتے ہیں؟ یا رکوع اور سجدہ کسی نئے طریقہ پر کرتے ہیں، شیخ نے فرمایا کہ عالموں کی انداز بس اسی قدر ہے کہ کعبہ کو نظر میں کریں، یا اگر دور ہیں تو جہت کعبہ کو، اور اگر اس کا بھی پتہ نہ چل سکا تو اندازہ سے جہت کعبہ کو تصور کر کے نماز شروع کر دی، لیکن درویشوں کی نماز یوں نہیں ہوتی، وہ جب تک عرش الٰہی پر نظر نہیں جما لیتے نماز نہیں شروع کرتے۔" (صفحہ ۲۳۷-۲۳۹)

آج کے بدعت نواز حال قال والے صوفیوں کو، وہ حضور قلب والی نہ سہی، وہ قاضی صاحب والی ظاہری نماز بھی نصیب ہے؟۔

مرت سے ایک لفظ "عشق و محبت" کا گڑھ لیا گیا ہے، ترک عبادت بلکہ ہر نافرمانی کو اسی پردہ میں چھپایا جاتا ہے، لیکن خود یہ محبت اور سچی محبت کی

کیلئے؟ اس کا جواب عاشقوں کے اسی سردار کی زبان سے لیجئے، فرماتے ہیں:-

صدق محبت متابعت ست ۔۔۔۔ یعنی محبت پیروی ہی کا دوسرا نام ہے

اور پھر فرماتے ہیں کہ محبت کا نقشہ جم جانے کے بعد معصیت کی جرأت ہی کیسے باقی رہ سکتی ہے،

چوں کسے محب ایشاں شد ہر آئینہ متابعت ایشاں کند و از ناشایستہ دور باشد، چوں ایں چنیں شود ہر آئینہ گناہ نہ نویسند، آنگاہ فرمود کہ تا محبت حق در غلافِ قلب باشد امکان معصیت ست اما، چوں محبت در سویدائے قلب در آید پیش امکان معصیت نہ باشد (ص ۲۰۹)

جب کوئی اُن سے محبت کرےگا تو یقیناً ان کی پیروی بھی کرےگا اور اعمال ناشایستہ سے دور رہےگا اور جب ایسا ہوگا تو لامحالہ اس کے گناہ بھی نہ لکھے جائیں گے، پھر ارشاد ہوا کہ محبت حق جبتک غلافِ قلب میں ہے گناہ کا امکان باقی ہے، لیکن جب محبت سویدائے قلب میں گھر کر جاتی ہے تو معصیت کا امکان نہیں باقی رہتا (یعنی عاشق صادق سے نافرمانی ممکن کیسے نکہو؟)

آج کتنے "عیان" چشتیت "کا رباراساز و سامان، ڈھول اور طنبورہ، ستار اور ہارمونیم کی نغمہ سرائیاں ہیں، اور قوالی کی محفلیں اگر نہ جمیں تو پھر درویشی اور خصوصاً چشتیت کا لطف ہی کیا رہا؟ لیکن ذرا شیخ کی آواز پر کان لگائیے، یہاں باجہ کے ساتھ سماع سرے سے جائز ہی نہ تھا،

کسے از حاضرین گفت کہ ہمدریں روزہا بعضے از درویشانِ آستانہ

حاضرین محفل میں سے ایک شخص نے کہا کہ ایک روز آستانہ مبارک کے

دار در مجمع کہ چنگ و رباب و مزامیر بود رقصہا کردند، خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر فرمود کہ نیکو نہ کردہ اند، آنچہ نامشروع ست ناپسندیدہ ست (ص۲۲۷)

حاضر باش بعض درویش ایسے مجمع میں جس میں چنگ و رباب مزامیر تھے، رقص کر رہے تھے، حضرت خواجہؒ نے فرمایا کہ برا کیا، جو شے شرعاً ناجائز ہے، وہ بری ہے۔

جب درویش لوٹ کر آئے تو ان پر گرفت ہوئی کہ اس مجلس میں باجہ بھی تھا، تم نے سماع کیسے سنا؟ انھوں نے جواب میں عرض کیا کہ "ہم سماع میں اس قدر غرق و مست ہو گئے کہ ہمیں باجہ کے ہونے نہ ہونے کا پتہ ہی نہ چلا" حضرت خواجہؒ نے ارشاد فرمایا کہ "یہ جواب لغو ہے، وہ عمل معصیت ہی لکھا جائیگا" (ص۳۲) ——— آج ہر قسم کی قوالی کے لئے سماعِ اکابرِ چشت کو آڑ بنا لینے والے خواجہ چشتؒ کی یہ سختیاں اور زبردست جرحیں سُن رہے ہیں؟

ایک بار کا ذکر ہے، ایک شخص نے آکر خدمتِ والا میں عرض کی کہ فلاں مقام پر آپ کے مرید باجہ کے ساتھ سماع سُن رہے تھے، شیخ نے ناگواری کے ساتھ فرمایا، کہ "بیجا حرکت کی ہے، کہہ چکا ہوں کہ باجہ نہ ہو" پھر اُسی کی تاکید و تصریح میں فرمایا کہ "نماز اگر جماعت کے ساتھ ہو رہی ہو، اور جماعت میں عورتیں بھی شامل ہوں، اور نماز میں امام کو سہو ہوا ہو، تو مرد تو سبحان اللہ کہہ کر امام کو متنبہ کر سکتے ہیں، لیکن عورت اگر لقمہ دینا چاہے تو آواز سے نہ کہے، کہ آواز نامحرموں کے کان میں جائے گی، بلکہ صرف ہاتھ پر ہاتھ مار کر امام کو متوجہ کر دے اور اس میں بھی یہ احتیاط رکھے کہ ہتھیلی ہتھیلی پر نہ مارے کہ یہ تالی بجانے کی سی شکل ہو گئی اور وہ لہو میں داخل ہے، بلکہ ہتھیلی کو دوسری ہتھیلی کی پشت پر مارے تو جب لہو کے درجہ کی چیزوں میں یہ احتیاط ہے کہ دستک تک کی اجازت نہیں، تو باجہ کیوں کر جائز ہو سکتا ہے" (ص۹۵) ——— ڈھول اور طنبورہ والی

قوالیوں کی چوکیوں کے سرپرست "مشائخ" اب کیا فرمائیں گے؟

لوگوں نے کہیں سے سُن پایا کہ شیخ سماع سنتے تھے، اور بس اسی کو مطلق صورت میں لئے پھرتے ہیں، شاید اس کی خبر ہی نہیں، کہ آپ کے ہاں قیدیں اور شرطیں کیسی کیسی کڑی لگی ہوئی ہیں،

گفت ہرگاہ کہ چند چیز جمع شود سماع آنگاہ شنود، و آں چند چیز چیست؟ مسمع و مسموع و مستمع و آلۂ سماع، آنگاہ ایں تقسیم را فائدہ فرمود و گفت کہ مسمع گویندہ ست او می باید کہ مرد باشد و مرد تمام بود، کودک نہ باشد و عورت نہ باشد، مسموع آنچہ می گویند، باید کہ ہزل و فحش نباشد، مستمع آں کہ می شنود او ہم باید کہ بحق بشنود و مملو از یاد حق باشد، آلت سماع چوں چنگ و رباب و امثال آں باید کہ درمیان نہ باشد، ایں چنیں سماع حلال است (ص ۲۴۶)

فرماتے تھے کہ سماع اُس وقت سُنے جب یہ چند چیزیں اکٹھا ہو جائیں اور وہ چند چیزیں ہیں کیا؟ ایک مسمع دوسرے مسموع تیسرے مستمع، چوتھے آلۂ سماع، پھر اس تقسیم کی شرح یوں فرمائی، مسمع سے مراد گانے والا ہے، اسے مرد بالغ ہونا چاہیے امرد اور عورت نہ ہو، مسموع سے مراد کلام ہے، کلام میں ہزل و فحش کی آمیزش نہ ہو، مستمع سے مراد سننے والا ہے، اسے چاہیے کہ اللہ کے لئے سنے اور اس کا دل یادِ الٰہی سے لبریز ہو، اور آلۂ سماع مثل چنگ و رباب وغیرہ کے کچھ نہ ہو جب یہ شرائط جمع ہوں، جب جا کر سماع جائز ہوگا،

آج عرس کے کتنے مجمعوں اور قوالی کی کتنی محفلوں میں یہ شرطیں اور

قیدیں پوری نہ سہی آدھے درجہ میں بھی ملحوظ رہتی ہیں؟ کتنے سماع خانوں کی مجلسیں اس معیار پر پوری اترتی ہیں؟ ——— لیکن اتنی شرطوں اور قیدوں والے سماع سے متعلق بھی ابھی قول فیصل سننا باقی ہے،

سماع صوتے ست وزاں چرا حرام باشد، دیگر تحریک قلب ست، اگر آں تحریک بہ یاد حق باشد مستحب ست و اگر میل بہ فساد حرام بود، (ص ۲۴۶)

سماع تو محض آواز موزوں کا نام ہے، محض اتنے کی حرمت کو کوئی وجہ نہیں، لیکن ساتھ ہی قلب کی بھی تو تحریک ہوتی ہے، سو اگر یہ تحریک اللہ کی یاد کی موجب تو مستحب ہے، لیکن اگر اس میں خرابی کا جزو ہو تو حرام ہے،

جس سماع چشتیہ کی اتنی دھوم تھی، اس کی کل حقیقت آپ نے دیکھ لی؟ سب سے بڑی اور تاکیدی شرط یہ ہے کہ باجہ کسی قسم کا نہ ہو، تالیاں تک نہ بجنے پائیں، پھر گانے والے بالغ مرد ہوں[۱]، عورتوں اور لڑکوں کے گانے کے جواز کی کوئی صورت ہی نہیں، پھر کلام بھی سرتاسر حقانی ہو، جذبات کو بھڑکانے والا نہ ہو، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سننے والا تمامتر مرد حق ہو، جذبات نفسانی سے لذت لینے والا نہ ہو، یہ سب شرطیں اکٹھی ہو لیں، جب جا کر سماع درست ہوگا، صرف درست، واجب جب بھی نہیں، اور اگر شرطیں پوری نہ ہوئیں، تو حرام! باجہ ہوا تو حرام، سننے والے میں، سنانے والے

---

[۱] پیشہ ور گویوں اور قوالوں کی کوئی گنجائش نہیں، محفل نظامی کے قوال تو امیر خسرو یا امیر حسن جیسے لوگ تھے! کوئی مناسبت ... سے فسق پیشہ قوالوں کو ہے؟

میں کلام میں، کہیں سے فسق کا دخل ہو گیا تو حرام! ——— آج کی چودھویں صدی کا التصوف، پہلی صدی ہجری کے مطابق نہ سہی، کاش اسی آٹھویں صدی ہجری کے ہندی تصوف ہی کے معیار کا ہوتا!

(۷) منطق الطیر[۱]

(از شیخ فریدالدین عطارؒ)

(الف) مصنفؒ

مسلم و مستند کتب تصوف میں ایک بڑا حصہ کلام نظم کا ہے، نثر پر گفتگو ہو چکی، اب نظم کا سرسری جائزہ لینا ہے، پہلے نمبر پر حضرت عطارؒ ہیں، جن کا نام حکیم سنائی کے ساتھ ساتھ زبانوں پر آتا ہے،

اسم مبارک محمد بن ابی بکر ابراہیم، کنیت ابو حامد یا ابو طالب، لقب فریدالدین، تخلص عطار، عام زبانوں پر اسم مشہور فریدالدین عطار،

ولادت مضافات نیشاپور میں ہوئی، مزار بھی وہیں ہے،

سنہ ولادت ۵۱۳ھ، سال وفات میں اختلاف ہے، نفحات الانس کی روایت کے مطابق ۶۲۷ھ، عمر کے بہت طویل ہونے پر سب تذکرے متفق ہیں، سبب وفات بھی سب کو مسلم ہے، یعنی تاتاریوں کے ہاتھ سے جام شہادت نوش فرمایا۔

ابتداء میں ایک بڑے دواخانہ کے مالک تھے، ایک روز اپنے کاروبار میں

---

[۱] ماخذ:- (۱) نفحات الانس (جامی) (۲) تذکرہ ہفت اقلیم (امین رازی) (۳) تذکرۃ الشعراء دولت شاہ سمرقندی) (۴) مفتاح التواریخ (ولیم ٹامس بیل)

تھے کہ ایک فقیر نے آکر صدا لگائی، کہ اللہ کے نام پر کچھ دلاؤ، یہ کچھ خبر نہ ہوئے، اس نے صدا پر صدا لگائی اور جب دیکھا کہ کچھ اثر نہیں ہوتا تو بولا ایسے دھندے میں لگے ہوئے ہو، تو جان کیسے دوگے؟ یہ جھنجھلا کر بولے "جیسے تم دوگے" فقیر نے کہا بھلا میری طرح کیا دوگے؟" یہ کہا اور سر کے نیچے کشکول رکھ کر لیٹ گیا، زبان سے لا الہ الا اللہ کہا اور روح پرواز کر گئی، شیخ کے قلب پر بڑا اثر پڑا دواخانہ کھڑے کھڑے لٹا دیا اور خود اسی وقت سے درویشی اختیار کر لی،

پہلے شیخ رکن الدین اسکاف کی خدمت میں کئی سال بسر کئے، پھر سفر زیارت بیت اللہ کو نکلے، اور بہت سے مشایخ کی خدمت میں رہے، بالآخر شیخ مجد الدین بغدادیؒ کے ہاتھ پر بیعت کی، اور آگے چل کر سلوک و عرفان کے وہ مراتب طے کئے کہ خود مرشد کے لئے باعث فخر ہوئے،

جلالت قدر کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے، کہ مولانائے رومؒ کے کلیات میں شیخ کا نام گویا مقتدا و پیشوا کی حیثیت سے آیا ہے، اور ان کی عظمت کا بار بار اعتراف ہے، مثلاً ؎

گر د عطار گشت مولانا شربت از دستِ شمس بود ش نوش

یا ایک اور غزل میں ؎

عطار روح بود و سنائی دو چشم او ما در پسِ سنائی و عطار آمدیم

یا ایک اور موقع پر ؎

ہفت شہر عشق را عطار گشت ما ہنوز اندر خم یک کوچہ ایم

اسی تعظیم و احترام کے ساتھ مثنوی میں بھی جا بجا نام لیا ہے، اور ان کے اشعار کو اپنے کلام میں ضم کیا ہے،

اور ملا جامیؒ لکھتے ہیں،

آں قدر اسرار توحید و حقائق اذواق
ومواجید کہ در مثنویات و غزلیات
وے اندراج یافتہ در سخنان ہیچ ازیں
طائفہ ثابت نمی شود جزاہ اللہ سبحانہ
عن الطالبین المشتاقین خیر الجزاء
(نفحات صفحہ ۶۹۷)

توحید کے جتنے اسرار و نکات اور
وجد و حال کے جتنے لطائف و حقائق
عطار کی مثنویوں اور غزلوں میں ملتے
ہیں اتنے طبقۂ صوفیہ میں اور کسی کے
ہاں نہیں ملتے، اللہ انکو تمام طالبین
عاشقین کی طرف سے بہترین جزا
عنایت کرے،

نظم و نثر میں تصنیفات بڑی کثرت سے چھوڑی ہیں، بعض روایتوں کے مطابق تو اُن کی تعداد قرآنی سورتوں کے ہم عدد یعنی ۱۱۴ ہے، قاضی نور اللہ شوستری نے مجالس المومنین میں یہی روایت اختیار کی ہے، چنانچہ کہتے ہیں

ہماں خریطہ کش دارئے فنا عطار
مقابل عدد سورہ کلام نوشت

کہ نظم اوست شفا بخش عاشقان حزیں
سفینہائے عزیز و کتابہائے گزیں

اس تعداد کی صحت کا علم تو عالم مطلق ہی کو ہے، البتہ ذیل کی کتابیں مستند کہی جاسکتی ہیں، اور ان میں سے بعض تو بہت مشہور بھی ہیں،

(۱) تذکرۃ الاولیاء، ۲ جلد نثر میں قدمائے صوفیہ کا مفصل تذکرہ)
(۲) منطق الطیر۔ (اس پر تبصرہ آگے آتا ہے)
(۳) مصیبت نامہ (۴) اسرار نامہ (۵) الٰہی نامہ (۶) دیوان (۷) جیسر نامہ (۸) پند نامہ (۹) وصیت نامہ (۱۰) خسرو و گل (۱۱) شرح القلب،

شیخ کی جانب منسوب ایک کتاب لسان الغیب کا قلمی نسخہ برٹش میوزیم (لندن) میں موجود ہے، لیکن اس کے جو اشعار مصنف کی شیعیت کے ثبوت میں پیش کیے گئے ہیں، وہ خود اس امر کی دلیل ہیں کہ یہ کتاب شیخ کی نہیں، شیخ کا اہل سنت

ہونا اپنی جگہ پر ثابت ہے، اور یہ کلام کسی اہل سنت کا نہیں ہو سکتا،
مزاج میں خاکساری اور فروتنی جس درجہ کی تھی، اس کی شہادت تذکرۃ الاولیا
کے دیباچہ کی سطر سطر دے رہی ہے، اپنے کو سب سے زیادہ حقیر و ناچیز سمجھتے تھے،
اور شاید یہ اسی انکسار و تواضع ہی کی مقبولیت کا ثمرہ ہے کہ آج ان کا نام سرآمد
عاشقاں و سرتاج عارفاں کی حیثیت سے زندہ و روشن ہے!

شہادت کا واقعہ تذکروں میں یوں درج ہے کہ تاتاریوں کے عین ہنگامہ میں
ایک سپاہی نے شیخ کو گرفتار کیا، ایک راہگیر نے بڑھ کر کہا کہ "دیکھنا، اس پیر مرد کو
قتل نہ کر دینا، دس ہزار اشرفیاں نقد دیتا ہوں کہ ان کو چھوڑ دو" شیخ نے کہا
"خبردار، اتنے پر مجھے فروخت نہ کر دینا، میں اس سے کہیں زیادہ قیمت رکھتا ہوں"
سپاہی خوش ہوا کہ دولت اس سے بھی بڑھ کر ہاتھ آئے گی، آگے بڑھے ایک اور
شخص ملا، اس نے کہا کہ میاں سپاہی اس بوڑھے کو مجھے دے ڈالو، میں ایک گٹھا
گھاس کا اس کے معاوضہ میں دیتا ہوں، شیخ بولے، ہاں دے ڈال، کہ میری قیمت
اس سے بھی کم ہے" سپاہی کے تن بدن میں آگ لگ گئی، کہ دس ہزار اشرفیاں نکلتی
ہوئی ہاتھ سے گئیں، جھلا کر وہیں معاً سرتن سے جدا کر ڈالا! واللہ اعلم،

(ب) تصنیف

قدماء ہی کے دور آخر میں بنیاد معارف روحانی و حقائق عرفانی کو نظم میں
ادا کرنے کی پڑ چکی تھی، متوسطین نے اسے معراج کمال پر پہونچا یا، سنائی، مغربی
عراقی، نظامی، ابوسعید ابوالخیر، خسرو، جامی، یہ سب اس بزم کے شناورہیں، اور
مولانا رومیؒ نے تو گویا زبان شعر کو الہامی بنا دیا، عطار بھی اسی جماعت کے ایک
ممتاز و مقتدر رکن ہیں، دیکھنا یہ ہے کہ یہ رند سرمست جب میکدۂ شعر میں قدم رکھتا ہے تو

جبہ و دستار کا احترام کس حد تک ملحوظ رکھتا ہے،

تذکرۃ الاولیاء کے بعد شیخ کی مقبول ترین تصنیف یہی منطق الطیر ہے، اس کی سب سے بڑی کرامت یہ ہے کہ مولانائے روم کی شہرۂ آفاق مثنوی معنوی کا نقش اول یہی مثنوی ثابت ہوئی، یعنی تذکروں میں یہ روایت صراحت کے ساتھ درج ہے کہ مولانا کے التفات خاص کے مورد جب حسام الدین چلپی ہوئے تو ایک روز انھوں نے عرض کی کہ حضرت غزلیات کا مجموعہ بہت ہو چکا، اب کچھ توجہ مثنوی پر ہو، اور شیخ عطار کی منطق الطیر کی طرز پر کوئی مسلسل نظم ارشاد فرمائی جائے، ادھر فرمایش پر عمل فرمایش سے قبل ہی شروع ہو چکا تھا۔

مثنوی معنوی اور منطق الطیر کا وزن ایک ہے، موضوع ایک ہے، اور افسانوں سے اخلاق و معرفت کے درس حاصل کرنے کا اسلوب ایک ہے، مولانا نے عطار کا حق تقدم اپنی مثنوی میں جا بجا تسلیم کیا ہے، اور جا بجا ان کے اشعار کو اپنے کلام میں ضم کرتے گئے ہیں،

مضامین کتاب کی ترتیب یہ ہے کہ حمد و نعت و منقبت خلفائے اربعہ کے بعد اصل قصہ کا آغاز ہے، افسانہ کے اشخاص (یا آج کی زبان میں کردار) بجائے انسانوں کے چند پرندے فرض کئے ہیں، ہدہد، طوطی، مرغ، فاختہ، قمری، بلبل، باز وغیرہا، ایک روز یہ سب پرندے یکجا ہوتے ہیں، اور اپنا بادشاہ منتخب کرنا چاہتے ہیں، ہدہد سیمرغ کا نام پیش کرتا ہے، اس پر دوسرے پرندے معترض ہوتے ہیں، ہدہد ایک ایک کا اعتراض سنتا اور الگ الگ سب کو جواب دیتا ہے، آخر اس پیامبر حق و عرفاں (ہدہد) کی تبلیغ و تفہیم سے تمام طیور شاہ شاہان سیمرغ کے حلقۂ اطاعت و انقیاد میں آجاتے ہیں ـــــــ سوالات وہی ہیں جو عموماً ہر طالب سالک کے دل میں پیدا ہوتے ہیں، اور ان کے جوابات ہی جادۂ سلوک و طریقت

کے مختلف مقامات ہیں،

لفظ منطق الطیر قرآن مجید ہی کی ایک آیت سے ماخوذ ہے، وَوَرِثَ سلیمان داود وقال یاایھاالناس عُلِّمنا منطق الطیر واُوتینا من کل شیئ (نمل، ع) ہدہد طیور سلیمان میں فہم ودانش میں سب سے ممتاز تھا، اس لئے شیخ نے طریقت کے حقائق ومعارف اسی کی زبان سے ادا کرائے ہیں،

حمد بہت مفصل لکھی ہے، سب سے زیادہ زور بندہ کی بیچارگی، بے علمی و درماندگی پر ہے،

لب بدوز از عرش وز کرسی مپرس
گرچہ یک ذرہ ہمی پرسی مپرس
عقل تو چوں در سر موئے بسوخت
ہر دو لب باید ز پرسیدن بدوخت
کس نہ داند کنہ یک ذرہ تمام
چند گویم کس نہ داند والسلام (ص۳)

اسمائے الٰہی "حکیم" و "لطیف" کی تجلیات حیرت انگیز ہیں، عقل بشری حوادث فطرت کو دیکھ کر دنگ رہ رہ جاتی ہے، انبیائے کرام تک کو عجیب وغریب حالات میں رکھا گیا ہے ؎

سوئے کنہ خویش کس را راہ نیست
ذرۂ از ذرۂ آگاہ نیست
در نگر اول کہ با آدم چہ رفت
عمرہا با او دریں عالم چہ رفت
باز بنگر نوح در غرقاب کار
تا چہ برد از کافراں سال ہزار

یعقوب کی سرگردانی وگریہ وزاری، یوسف کی غلامی واسیری، ایوب کی ستم کشی وبرداشت مصائب، یہ چند نمونے ہیں باقی تقریباً تمام انبیاء کی زندگی طلسم ساز فطرت کی انہی کرشمہ زائیوں کا ایک مسلسل مظہر ہے، اور تو اور خود سرور انبیاء تک کی حیات طیبہ اسی قسم کے خوارق فطرت سے لبریز ہے ؎

عنکبوتے را بہ حکمت دام داد
صدر عالم را درو آرام داد (ص۷)

معرفت باری کی صورت صرف یہ ہے کہ انسان اپنی خودی کو اس ہستیِ مطلق میں گم کردے،

تو مباش اصلا کمال این ست و بس | تو درو گم شو وصال این ست و بس
تو درو گم شو حلول این بود | ہر چہ آن نبود فضولے آن بود

اس تک رسائی کا راستہ صرف یہ ہے کہ اپنی بے بسی، عجز کا اعتراف کیا جائے بجائے خدا سے ڈرنے کے خود اپنے سے ڈرا جائے، اور بارگاہ ارحم الراحمین میں بہ تضرع والحاح مناجات کی جائے، کہ وہ اپنے درد محبت کا ایک ذرہ ہی عنایت کردے،

خلق ترسد از تو من ترسم ز خود | کز تو نیکی دیدہ ام وز خویش بد

لوگ تو تجھ سے ڈرتے ہیں لیکن میں اپنے ہی سے ڈرتا ہوں، اس لئے کہ تجھ سے تجربہ تو بھلائی کا ہوا ہے اور اپنے سے تجربہ برائی کا،

.. ..

اے فضیلت نا شدہ نا امید کس | حلقۂ داغ تو ام جاوید و بس

تیرے فضل و رحمت سے آج تک کوئی مایوس نہیں ہوا ہے، تیری ہی غلامی کا داغ میرے لئے ہمیشہ کو کافی ہے،

ہر کرا خوش نیست دل بر درد تو | خوش بباد الا آنکہ بنود مرد تو

جو دل تیرے درد سے لطف لینے والا نہیں، وہ نالائق کسی خوشی کے قابل ہی نہیں،

ذرہ دردم دہ اے درمان من | زانکہ بے دردت بمیرد جان من

اے میرے طبیب درد محبت کا ایک ذرہ عنایت کر، کہ تیرے درد محبت کا نہ ہونا تو میری جان کی موت ہے،

کفر کافر را و دیں دیندار را | ذرۂ دردت دلِ عطار را (ص۱۴)

کافر کو کفر مبارک رہے اور دیندار کو دین اور عطار کو تیرے درد کا ایک شمہ

نعت گوئی شیخ عطار کا خاص جوہر ہے، کہنا چاہئے کہ اس صنف سخن کے مالک ہیں، خلوص و نیاز کا رنگ لفظ لفظ سے پھوٹا پڑتا ہے ؎

خواجۂ دنیا و دیں گنج وفا | صدر و بدرِ ہر دو عالم مصطفےٰ

آفتاب شرع و دریائے یقیں | نورِ عالم رحمۃ للعالمیں

خواجۂ کونین سلطانِ ہمہ | آفتابِ جان و ایمان ہمہ

پیشوائے ایں جہاں وآں جہاں | مقتدائے آشکار و در نہاں

خواجۂ کز ہر چہ گویم بیش بود | ور ہمہ چیز از ہمہ در پیش بود

آفرینش راجز او مقصود نیست | پاکدامن تر از و موجود نیست

عقل را در خلوت او راہ نیست | علم جز از وقت او آگاہ نیست

رفت موسیٰ بر بساطِ آنجناب | خلع نعلیں آمدش از حق عتاب

باز در معراج شمعِ ذوالجلال | می شنید آور ز نعلینِ بلال

موسیٰ عمراں چوں آں دولت بدید | چاکر او را چنیں قدرت بدید

گفت یارب امت او کن مرا | در طفیل ہمت او کن مرا (ص۱۵-۱۴)

حضرات انبیاؑ کے درمیان تفاضل امتی کو زیب نہیں دیتا، بلکہ ایک حد کے آگے تو قطعاً ناجائز ہے، لیکن اگر انھیں حدود تک رہے تو شاید چنداں مضائقہ بھی نہ ہو۔

آگے مناقب خلفاء اربعہ کا بیان ہے، بعض حلقوں میں عطارؒ کو امامیہ مشہور کرنے کی جو عجیب کوشش ہوئی تھیں، اور اس کی تائید میں جو لغو اشعار ان کی جانب منسوب کئے گئے ہیں، ذرا اس کو پیش نظر رکھ کر ذیل کی مدحِ صحابہ سننے کے

قابل ہے، ابتداء "افضل البشر بعد از انبیاء" سے ہوتی ہے ؎

خواجۂ اول کہ اول یار اوست | ثانی اثنین اذہما فی الغار اوست
صدر دیں صدیق اعظم قطب حق | در ہمہ چیز از ہمہ بردہ سبق
ہرچہ حق از بارگاہ کبریا | ریخت در صدر شریف مصطفیٰ
آں ہمہ در سینۂ صدیق ریخت | لاجرم تا بود از تحقیق ریخت

فاروق اعظمؓ کی جلالت قدر کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے،

خواجۂ شرع آفتاب شرع دیں | ظل حق فاروقؓ اعظم شمع دیں
ختم کردہ عدل و انصافش بحق | تا فراست بردہ بر جنس سبق
آنکہ دارد بر صراط اول گذر | ہست او از قول پیغمبر عمرؓ (ص۲۱)

ذو النورین کی فضیلت مراتب پر روشنی ڈالنے کے لئے اشعار ذیل کافی ہیں ؎

خواجۂ سنت کہ نور مطلق است | بل خداوند دو نور برحق ست
آنکہ غرق قدس قرآں آمدست | صدر دیں عثمانؓ عفاں آمدست
روشنئے کاں عرصۂ کونین یافت | از دل پر نور ذو النورین یافت
یوسف ثانی بہ قول مصطفیٰ | بحر تقویٰ و حیا کان وفا

اہل سنت کا عقیدۂ صحیح ناقص و ناتمام رہ جائے گا اگر حضرت علی مرتضیٰؓ کے حضور میں عقیدت کا گلدستہ نہ پیش کیا گیا ؎

خواجۂ حق پیشوائے راستیں | کوہ حلم و بحر علم و قطب دیں
ساقی کوثر امام رہنمائے | ابن عم مصطفیٰ شیر خدائے
مرتضیٰ و مجتبیٰ زوج بتول | خواجۂ معصوم داماد رسول
مقتدائے دین باستحقاق اوست | مفتی مطلق علی الاطلاق اوست

ان کے بعد شرح و بسط کے ساتھ کئی ورق اس موضوع کی نذر کئے ہیں کہ

جو لوگ خلفائے ثلٰثہ سے تعصب رکھتے ہیں، وہ خود علی مرتضیٰؓ کی تعلیم وہدایت کے مخالف بلکہ دشمن ہیں اور اس قول کی تائید میں آپ کی سیرت مبارک سے کئی واقعات نقل کئے ہیں،

ہدہد یا پیغمبر حق تمام طیور جمع ہونے پر انھیں دعوت دیتا ہے کہ سب اپنے کو سلطان مطلق کی حکومت و انقیاد میں لے آئیں اور یہ رتبۂ سلطانی حق سیمرغ کا ہے، ساتھ ہی وہ اس سیمرغ کے اوصاف بھی بیان کرتا ہے، ان صفات پر نظر کرنے سے سمجھ میں خود آجائے گا کہ سیمرغ سے کنایہ کس ذات عالی کا ہے اور افسانہ کے پردہ میں کن حقائق و معارف کی تلقین ہو رہی ہے،

نام او سیمرغ سلطانِ طیور	او بما نزدیک، وما زو دور دور
صد ہزاراں پردہ دارد بیشتر	ہم ز نور و ہم ز ظلمت بیشتر
در دو عالم نیست کس را زہرہ	کو تواند یافت از وے بہرہ
دائما او پادشاہ مطلق ست	در کمال عز خود مستغرق ست
نے بدو رہ نے شکیبائی ازوست	صد ہزاراں خلق سودائی ازوست
ہیچ دانائے کمالِ او ندید	ہیچ بینائے جمالِ او ندید (ص ۳۸)

یعنی وہ ہم سب کا بادشاہ ہم سب سے متصل ہے، ہم ہی البتہ اس سے بیگانہ ہیں، وہ لاکھوں پردوں میں ہے، اور اس کا وجود نور وظلمت دونوں سے قبل سے ہے، کائنات میں کسی کی مجال نہیں کہ وہ اس سے ہمسری کا دعوا کر سکے، وہ سب کا ازلی وابدی بادشاہ مطلق ہر وقت اپنے شان کمال میں غرق ہے، ہزارہا مخلوق اس غم میں پریشان ہے، کہ نہ اس تک رسائی کی راہ پاتی ہے، اور نہ اس کی طرف سے صبر کرکے بیٹھ جانا ممکن ہے، نہ کوئی عقل اس کے کمال کو آج تک پہنچ سکی ہے، نہ کوئی آنکھ اس کے جمال سے مشرف ہو سکی ہے،

باقی ساری کتاب اسی حقیقت الحقائق، اسی ذات علی الاطلاق، اسی ہستی وراء الوراء کی توصیف اور اس تک رسائی کی تدبیر اور منازل سفر کی تفصیل کی نذر ہے، چند مضامین و مطالب بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں، یہی انداز ساری کتاب کا ہے،

راہ طلب و سلوک میں سب سے بڑا رہزن نفس کا شوق جاہ و ترفع ہے، انسان بڑی بڑی ریاضتیں گوارا کر لیتا ہے، سخت سے سخت مجاہدے جھیل لے جاتا ہے، کہ خلق میں اس کے زہد و عبادت کی شہرت ہو جائے، حالانکہ یہی حُبِ جاہ اس سفر میں سخت ترین سنگ گراں ہے، شیخ شبلی ایک مرتبہ لوگوں کی نظر سے غائب ہو گئے بڑی تلاش کے بعد مخنثوں (زنانوں) کے ایک گروہ کے درمیان بیٹھے ہوئے ملے، آنکھیں تر اور ہونٹ خشک، کسی نے حیرت کے ساتھ سوال کیا، آپ نے جواب دیا کہ جیسے یہ لوگ نہ عورت ہیں نہ مرد، میں بھی راہ دین میں نہ مرد ہوں نہ عورت، بد اعمالیوں کی کثرت سے میری زندگی خود میرے لئے باعث شرم ہے، —— عارف کو چاہیئے کہ اسی طرح اپنے کو ذلیل و خوار رکھے، ؎

ہمچو مردان ذل خود کن اختیار	گر رہ استادگان عزت نثار
گر تو پیش آئی ز موئے در نظر	خویشتن را از تے سازی بتر
مدح و ذمت گر اتفاقت میکند	تگرے باشد کہ ادبت می کند
گر تو حق را بندۂ، تگر مباش	در تو مردے از دی، آذر مباش
نیست ممکن درمیان خاص و عام	از مقام بندگی برتر مقام
چون ترا صد بت بود در زیر دلق	چون نمائی خویش را صوفی بہ خلق
اے مخنث جامہ مردان مدار	خویش را زین بیش سر گرداں مدار منہ

ایک مرتبہ قاضی شہر کے پاس دو صاحب اپنے مقدمہ کا فیصلہ کرانے آئے،

دونوں لباس اور ظاہر سے صوفی بنے ہوئے۔ قاضی انھیں تنہائی میں لے گئے اور بڑی غیرت دلائی کہ "جسم پر لباس توبہ ترک و تسلیم کا، اور دل بدستور من و تو کے جھگڑوں میں اٹکا ہوا، اگر دل ترک پر آمادہ نہیں، تو یہ لباس ہی پہننا کیا ضرور تھا۔ "میں تزکیۂ باطن کا دعوی نہیں رکھتا، محض مقدمات چکاتا ہوں، لیکن میں اس لباس سے شرمایا جاتا ہوں"۔ ——— یہ درویشی تو تمامتر ترک و تحمل کا سودا ہے:

در خصومت آمدند و در جفا | دو مرقع پوش درد ار القضا
قاضی ایشاں را بہ کنجے برد باز | گفت صوفی خوش بناشد جنگ باز
جامۂ تسلیم در بر کردہ اید | ایں خصومت از چہ در سر کردہ اید
گر شما ہستید اہل جنگ و کیں | ایں لباس از تن بیفگند از بہر ایں
در شما ایں جامہ را اہل آمدید | در خصومت از سر جہل آمدید
منکہ قاضی ام نہ مرد معنوی | زیں مرقع شرم میدارم قوی
گر بہ دعوی عزم ایں میداں کنی | سر دہی بر باد ترک جاں کنی[1] (ص۱۰۳)

نفس کی شقاوت کی کوئی حد نہیں، انسان کی نظر سے دردانگیز و عبرتناک واقعات کیسے کیسے ہر روز گزرتے رہتے ہیں، پھر بھی اسے عبرت حاصل ہوتی ہے نہ نصیحت، کسی نے ایک مسن گورکن سے سوال کیا، کہ "تمھاری تو عمر قبر دنے کے کھودنے میں گزری یہ بتاؤ کیا کیا عجائبات نظر سے گذرے"۔ جواب ملا کہ سب سے بڑا اعجوبہ یہ ہے کہ ستر سال گورکنی کرتے ہوئے ہوئے اور اپنا نفس ایک لمحہ کیلئے بھی مردہ نہ ہوا ہے

یافت مرد گورکن عمرے دراز | سائلش گفتہ کہ چیزے گوے باز
تا چہ عمرے گور کندی در مغاک | چہ عجائب دیدہ در زیر خاک

---

[1] سجادگی اور نذر و نیاز کے دعویدار، مقدمہ باز قسم کے "مشائخ" نے یہ حکایت سن لی ہے۔

گفت ایں دیدم عجائب جسب حال | کیں سگ نفسم ہمیں ہفتاد سال
گور کردن دید یک راعت نمرد | یک زماں فرمان دیگر طاعت نبرد

سب سے زیادہ زور دینے کے قابل علائق دنیوی کا ترک ہے، حب دنیا حیات ایمانی کے حق میں زہر ہے، ؎

حب دنیا ذوق ایمانت ببرد | از زدیش پر تو جانت ببرد
چیست دنیا آشنائے حرص و آز | ماندہ از فرعون و نمرود باز
کار دنیا چیست؟ بیکاری ہمہ | چیست بیکاری؟ گرفتاری ہمہ
ہست دنیا آتش افروختہ | ہر زماں خلقے دگر را سوختہ (صفحہ ۱۰۸)

ایک مرتبہ حضرت عیسیٰؑ کھری زمین پر استراحت فرما رہے تھے اور سر کے نیچے ایک چھوٹی سی اینٹ تکیہ کے طور پر رکھ لی تھی، آنکھ کھلی تو دیکھتے ہیں، کہ ابلیس پاس ہی کھڑا ہے، فرمایا، ملعون، تیرا یہاں کیا کام ہے؟" اس نے جواب دیا "یہ اینٹ میری ملک ہے، ساری دنیا ہی میری ملک ہے، اور یہ اینٹ بھی اسی کا ایک جزو ہے، آپ اس کو اپنے کام میں لائے، تو آپ نے خود ہی مجھ سے توسل پیدا کیا، حضرتؑ نے یہ سنتے ہی اینٹ پھینک دی اور دوبارہ استراحت کو لیٹے، ابلیس بولا "اب بیشک آرام کیجئے، اب میرا یہاں ٹھہرنے کا کوئی کام نہیں رہا۔" (صفحہ ۱۰۸-۱۱۹)

ایک صاحب نے بعد نماز دعا کی کہ "کارساز عالم! میرے حال پر رحم کر۔" ایک دل جلا جل کر بولا "تم اور طلب رحمت! ہمہ وقت تو اپنی خود پرستیوں میں مست ہو، مکان ہے تو عالی شان، در و دیوار ہیں تو زرنگار، کام کاج کے لئے غلاموں کی کھیپ کے محتاج، کنیزوں کی ضرورت۔ اس پر مستزاد خود پرستی میں یہ انہماک و اہتمام، اور اس پر نزول رحمت کی توقع و طلب؟ اگر واقعی رحمت

باری کی تمنا ہے تو پہلے اپنے کو غیر سے تو فارغ البال کرو ——
وَتَبَتَّلْ اِلَیْهِ تَبْتِیْلًا ؎

تو ز ناز خود نہ گنجی در جہاں	می خرامی از تکبر ہر زماں
منظرے سر بر فلک افراشتہ	چار دیوارش بزر بنگاشتہ
دہ غلام و دہ کنیزک کردہ راست	رحمت آنجا کے بود بر گوے راست
نیک بنگر تا تو با ایں جملہ کار	جائے رحمت داری آخر شرم دار
روئے اکنوں می بگرداں از ہمہ	تا شوی فارغ چوں مرداں از ہمہ ص۱۰۹

مومن کو رحمت الٰہی کی طرف سے مایوس کبھی نہ ہو جانا چاہیئے، گناہ کیسے ہی اور کتنے بھی ہوں، بہر حال رحمٰن ورحیم کی رحمت ان سے وسیع تر ہے، یاس تو صرف کافروں کا حصہ ہے، مومن کو چاہیئے کہ ہر حال میں اس کی رحمت پر بھروسہ رکھے اور اپنی طرف سے توبہ میں مشغول رہے،

اس مفہوم کو مختلف پیرایہ میں بار بار ادا کیا ہے، مثلاً کہیں یوں ؎

تو یقیں می داں کہ صد عالم گناہ	از تف یک توبہ برخیزد زراہ
بحر احساں چوں در آید موج زن	محو گرداند گناہ مرد و زن

اور کہیں یوں ؎

گر نبودے مرد را توبہ قبول	کے بدے ہرگز رلئے او ز دل
گر گنہ کردی در توبہ ست باز	توبہ کن کیں در نخواہد شد فراز
گر بہ صدق آئی دریں رہ یکدمے	صد فتوحت پیش آید ہر دمے (ص۱۶۶)

اصل شے اخلاص وصدق نیت ہے، حد یہ ہے کہ اگر شرک بھی اخلاص کے ساتھ ہے تو عالم الغیب والشہادۃ کی بارگاہ سے بالآخر ہدایت نصیب ہو کر رہے گی، شیخ حکایت لکھتے ہیں کہ ایک شب حضرت جبرئیلؑ نے مقام

قرب میں تھے کہ حضرت قدس سے صدا لبیک کی سُنائی دی، سمجھے کہ کوئی خاص مقبول بندہ اس وقت ذکر و عبادت میں مصروف ہے، اور اس کی پذیرائی ہو رہی ہے، جی میں آئی کہ اس کا پتہ لگائیے، دم بھر میں ہفت افلاک کا چکر لگا ڈالا، اس کا پتہ نہ چلا کرۂ زمین کا رخ کیا، اس کا کونہ کونہ چھان ڈالا، پتہ پھر بھی نہ چلا اپنے مقام پر واپس آئے، دیکھا کہ حضرت قدس سے صدائے لبیک برابر چلی آ رہی ہے، تلاش از سر نو شروع کی، اور اب کی بھی ناکام رہے، عاجز آ کر بارگاہ اعلیٰ میں عرض کی۔ حکم ہوا ملک روم میں جا کر دیکھو، آ کر کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بت کے آگے اس کی عبادت ہو رہی ہے، دنگ و حیران ہو کر عرض کی، یہ آخر کیا راز ہے کہ صریح بت پرستی پر یہ رحمت"! جواب سنئے ؎

حق تعالیٰ گفت ہست او دل سیاہ
زاں نمی داند غلط کردست راہ
از نیازش خوش ہمی آید مرا
زیں نشان دادن ہمی باید مرا
گر ز غفلت رہ غلط کرد آں سقط
من نمی دانم نہ کردم رہ غلط
ہم کنوں را بیش ہم تا پیش گاہ
لطف او خواہد شد او را عذر خواہ

وہ نادانی سے غلط راہ پر پڑ گیا ہے تو کیا ہوا ہم تو اس کے خلوص قلب کو دیکھ رہے ہیں وہ اسوقت گمراہ ہو تو ہوا کرے ہم ابھی اس کے خلوص نیت کا انعام یہ دیتے ہیں کہ وہ راہ راست پر آیا جاتا ہے۔ (ص ۹۷)

چنانچہ ؎

ایں بگفت و راہ جانش بر کشاد
در خدا گفتن زبانش بر کشاد

معاً اس کا قلب روشن کر دیا گیا، کشود کار کے مرتبے آناً فاناً طے کرا دئے گئے، اور وہ مشرک و بت پرست

بات، کہتے کہتے موحد و خدا پرست
ہو گیا،

شیخ کے نظام عمل میں سب سے بلند و مقدم مرتبہ، احکام الٰہی کے اتباع کا ہے، ایک مرغ (زبان تمثیل میں روح) کی زبان سے سوال ہوتا ہے کہ

دیگرے پرسید از و کہ رہنمائے	تعمیل ارشاد اور فرماں برداری
چوں بود گر من امر آدم بجائے	کے باب میں کیا ارشاد ہے؟
من نہ دارم با قبول و ردکار	مجھے اختیار و انکار سے سروکار
می کشم فرمان او در انتظار	نہیں، میں تو محض اتباع امر
	کرنا چاہتا ہوں۔

(رہبر یعنی پیغمبر حق) کی طرف سے جواب ملتا ہے کہ

گفت نیکو کردی اے مرغ سوال	اس سے بلند تر کوئی بھی مرتبہ نہیں یہ
مرد را زیں بیشتر نبود کمال	مرتبہ اور سارے مرتبوں سے اعلیٰ و
کے بری جاں گر تو آنجا جاں بری	افضل ہے، تعمیل امر میں ایک
جاں بری گر تو بہ جاں فرماں بری	ساعت کی بھی طاعت ساری عمر کی
ہر کہ فرماں برد از خذلاں برست	طاعت گزاریوں اور مجاہدوں سے
از ہمہ دشوارہا آساں برست	بہتر ہے جو اپنی مرضی اور رائے
طاعتے بامر گر یک ساعت است	کئے جائیں،
بہتر از بے امر عمر طاعت است	(ص ۱۳۹)

انسان بندہ ہے، اس کا کمال یہی ہے کہ بندگی میں کمال پیدا کر دکھائے،

بندگی ایں باشد و دیگر ہوس	بندگی افگندگی اے، ہیچ کس
تو خدائی می کنی نے بندگی	کے شود ممکن ترا افگندگی

مقبولیت اور برگزیدگی کا دعویٰ آسان ہے، لیکن اس دعویٰ پر دلیل بھی کمالِ عبودیت و افگندگی ہے ؎

بندہ آں نبود کہ از روے گزاف　　　می زند در بندگی پیوستہ لاف

بندۂ وقت امتحاں آید پدید　　　امتحاں کن تا نشاں آید پدید

کتاب اوّل سے آخر تک تمام ہو گئی، کہیں ذکر ثانوی بلکہ ضمنی حیثیت سے بھی نہ دھوم دھام والے عرسوں کا آیا اور نہ پُرشکوہ قوالیوں نہ مزار کی چادروں کا، نہ قبّے اور گنبد کا، اور نہ بیسیوں دوسرے گڑھے ہوئے رسوم صوفیہ کا۔

---

(۸) لوائح

(ملا نور الدین عبد الرحمٰن جامیؒ)

(الف) مصنف

ملا جامیؒ کا زمانۂ وفات نویں صدی ہجری کے اختتام کا ہے، اس لئے انھیں دور متوسطین کی آخری یادگار کہہ سکتے ہیں، یہ وہ زمانہ ہے کہ تصوف ایک مستقل نظام کی حیثیت اختیار کر چکا تھا، اور اسلام کی سادہ تعلیم میں فلسفہ اور غیر مذہب کی آمیزش اچھی طرح ہو چکی تھی،

اسم گرامی قول مشہور کے مطابق نور الدین عبد الرحمٰن تھا، سفینۃ الاولیاء کی روایت ہے کہ اصل نام عماد الدین تھا، مشہور نام نور الدین ہو گیا، والد کا نام ایک روایت میں احمد بن محمد دشتی آیا ہے، دوسری میں نظام الدین احمد دشتی، دشت اصفہان کے ایک محلہ کا نام ہے،

ولادت قصبۂ جام میں ہوئی، کچھ اس مناسبت سے، اور کچھ اس لحاظ سے بھی کہ شیخ الاسلام احمد جام کی عقیدت کا جام نوش فرمایا تھا، اپنا تخلص جامیؔ قرار دیا، خود فرماتے ہیں:-

---

[1] ماخذ:- (۱) نفحات الانس (جامی) (۲) سفینۃ الاولیاء (داراشکوہ) (۳) مفتاح التواریخ (مسٹر بیل)

مولدم جام و رشحۂ قلمم   جرعۂ جام شیخ اسلامی ست
لاجرم در جریدۂ اشعار   بدو معنی تخلصم جامی ست

تخلص اس قدر مقبول ہوا کہ لوگ نام بھول گئے، عام زبانوں پر صرف جامی یا مُلّا جامی رہ گیا،

تاریخ ولادت بالاتفاق ۲۳ شعبان ۸۱۷ھ (۷ نومبر ۱۴۱۴ء) ہے اور تاریخ وفات بہ روایت قوی ۱۸ محرم ۸۹۸ھ (۹ نومبر ۱۴۹۲ء) ہے،[1] ایک ضعیف روایت سنہ ۱۵۰۱ء سے متعلق بھی ہے، وفات شہر ہرات میں ہوئی،

بیعت سلسلۂ نقشبندیہ میں مولانا سعد الدین کاشغری سے تھی، بچپن میں پانچ سال کے بھی سن سے پہلے، خواجہ محمد پارسا نقشبندی کی زیارت سے مشرف ہوئے، طریق روحانیت کی تخم ریزی قلب میں اسی وقت سے ہوگئی، ۶۵ سال کی عمر میں جب نفحات الانس کی تالیف میں مشغول ہوئے ہیں، اس واقعہ کا تذکرہ اس انداز سے کرتے ہیں، کہ قلم سے گویا سیاہی کے بجائے عقیدت کے قطرے ٹپک رہے ہیں، سنہ ۸۲۲ھ تھا کہ آخر جمادی الاول یا آغاز جمادی الآخر میں خواجہ موصوف جام سے گذر رہے تھے، خلقت گروہ در گروہ نذر و اخلاص و عقیدت پیش کرنے حاضر ہو رہی تھی، ملا جامی کے والد ماجد نے اس خورد سال بچہ کو خواجہ کی پالکی میں لاکر بٹھا دیا، خواجہ نے التفات خاص فرمایا، اور ایک سیر مصری عنایت کی، اس سرگذشت کو قلمبند کرنے کے بعد لکھتے ہیں:-

"امروز آں شصت سال است کہ ہنوز صفائی طلعت منور ایشاں در دلِ من و ہماناکہ رابطۂ اخلاص و اعتقاد و ارادت و محبتے کہ ایں فقیر را نسبت بہ خاندان خواجگان قدس اللہ تعالیٰ روا حہم واقع

---

[1] یہ تاریخیں حسب بیان اِن سائکلو پیڈیا آف اسلام (طبع دوم) ہیں۔

سبب برکت ایشاں بودہ باشد وامید می دارم کہ بہ یمن ہمیں رابطہ درزمرۂ محباں ومخلصان ایشاں محشور گردم (نفحات، صد ۴۴۹-۴۵۰)

مگر سب سے زیادہ ارتباط واختصاص شاید خواجہ عبید اللہ احرار کے ساتھ تھا اُن کا تذکرہ نفحات اور اپنی دوسری کتابوں میں کمال عقیدت و تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔

علوم ظاہری کی تعلیم ہرات میں پائی، استادوں میں نام ملا جنید، خواجہ علی سمرقندی و قاضی زادہ سمرقندی کے ملتے ہیں، طالب علمی کے زمانہ میں بڑے ذہین اور بڑے قوی الحافظہ تھے۔ ذکاوت، جودت ذہن، قوت حافظہ، ان سب کے عجیب وغریب واقعات تذکروں میں ملتے ہیں، شوخ وظریف بھی تھے۔ اس کا ثبوت آج تک بہارستان کے صفحات دے رہے ہیں۔

"حضرت مولانا را فہم وطبعے کہ بود بالاتر از آں من باشد وبسیار خوش خلق وخوش تکلم وشگفتہ بودند ومطایبہائے لطیف می فرمودند" (سفینۃ الاولیاء)

تصانیف کی تعداد لفظ جام کے ہم عدد، ۴۴ ہے، مشہور یہ ہیں:۔

یوسف وزلیخا، تحفۃ الاحرار، سبحۃ الابرار، نفحات الانس، شواہد النبوۃ، لوائح، بہارستان، شرح کافیہ اور کلیات،

مرید سلسلہ نقشبندیہ میں تھے، لیکن طبیعت پر ذوق ووجد چشتیہ کا سا غالب تھا، "ہمیشہ در ذوق ووجدمی بودہ اند" (سفینہ) اور شاید اسی لئے سماع سے بھی محترز نہ تھے،

مثنوی، غزل، قصیدہ وغیرہ نظم کی ہر صنف پر قادر تھے، اور مدح تشبیب، معرفت، توحید، وغیرہ ہر مضمون کے مالک تھے، سب سے بڑھا چڑھا رنگ

نعت کا تھا۔ اس جوش و خروش کی نعتیں فارسی میں کمتر کسی کی ملیں گی،

مرتبۂ کمال کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ خود ان کے مرشد فرمایا کرتے تھے کہ "شہباز ہمارے جنگل میں آپھنسا ہے"۔ (سفینۃ) خواجہ عبید اللہ احرار اتنی تعظیم برتتے کہ اپنے خطوط کو لفظ "عرضداشت" سے تعبیر کرتے اور اکثر فرماتے تھے کہ "خراسان میں تو آفتاب موجود ہے، لوگ اُسے چھوڑ کر ماوراء النہر کے چراغ (یعنی میرے پاس) کیوں آتے ہیں" گویا مُلّا جامی کو آفتاب ٹھہراتے اور اپنے کو چراغ،

احوال و کرامات کے اخفا میں خاص اہتمام تھا، جہاں تک بس چلتا کسی پر اپنے مرتبۂ کمال کو نہ ظاہر ہونے دیتے، باایںہمہ مرجع خلائق تھے،

"مقبول عالم و مقتدائے ماوراءالنہر و خراساں و پیشوائے زماں بودہ اند و سلطان حسن بایقرا بالکمال عقیدت و نیازمندی بخدمت ایشاں بود"

(سفینہ)

سلطان اور امراء کی عقیدتمندیوں کے مرکز تھے،

"در عہد سلطان ابوسعید بہ خداشناسی و خداپرستی شہرت یافتہ مقبول خاص و عام گشت، و در عہد سلطان حسن بایقرا بیشتر از بیشتر قبول یافت و امیر علی شیر غاشیۂ انقیاد او بر دوش جاں می داشت۔" (مفتاح التواریخ)

خانۂ کعبہ کی زیارت کو گئے، تو آمد و رفت دونوں موقعوں پر قبول عام نے قدم قدم پر استقبال کیا، ایک مرتبہ دمشق میں مقیم تھے کہ سلطان روم کا قاصد پانچ ہزار اشرفیوں کی نذر لئے ہوئے، اس درخواست کے ساتھ پہونچا کہ قسطنطنیہ بھی اشرف قدوم سے مشرف ہوجائے، مولانا قاصد سلطانی کی آمد کی خبر پاکر قاصد کے ورود سے قبل ہی تبریز چل کھڑے ہوئے تھے، یہاں حاکم

کردستان حسن بیگ کی نیاز مندیاں زنجیر پا ہونے لگیں، بہ مشکل تمام اجازت لے کر خراسان پہونچے۔ یہاں پہونچے تو یہاں بھی نذرانوں کے انبار نے خیر مقدم کیا،

(ب) تصنیف

لائحہ" کے لفظی معنی شعاع درخشاں کے ہیں، مجازی معنی تختۂ عمل یا روزنامچہ کے ہیں، لوائح اس کی جمع ہے، لوائح جامی چند لائحوں کا مجموعہ ہے، کل تعداد نسخہ نولکشوری کے مطابق ۴۳ ہے، اور نسخہ لندنی کے مطابق اس سے کم، قدماء فن کی تصانیف کی طرح سلوک کے علم و عمل پر یہ کوئی جامع و مبسوط رسالہ نہیں، بلکہ صرف فلسفۂ تصوف سے متعلق چند لطائف و اشارات کا مجموعہ ہے، زمانۂ تالیف وہ ہے، کہ یونانی مشرکوں کے فلسفہ کو مسلمانوں میں رائج ہوئے کئی سو سال ہو چکے ہیں، اور اشراقیت، و مشائیت، تناسخ و حلول، عقل کل اور ہیولیٰ اور اسی طرح کے خاک بلا، کیسے کیسے عقائد واوہام، یونانی مصری، ہندی، ایرانی فلسفہ نجوم اور جوگ کے اثر سے اسلامی مدرسوں اور خانقاہوں میں داخل ہو چکے ہیں، اور خود مسلمانوں کے اندر شیخ الاشراق، اور طوسی اور فارابی اور ابن سینا اور ابن رشد جیسے "معقولی" بڑی تعداد میں پیدا ہو چکے ہیں، اور ان کے خرافات توحید کے خاندان کے گھر گھر پھیل چکے ہیں،

اسلامی تصوف اب قرآن و سنت پر عمل کا نام نہ تھا، جنید و ذوالنون کا تصوف صحابۂ کرام کی تقلید تھی، ان کے عقائد و اعمال ابوبکرؓ و علیؓ کے عقائد و اعمال تھے، اب دور وہ تھا کہ ہر چیز عقلی بن چکی تھی، شیخ ابن عربیؒ اور ان کے شاگردوں کے طفیل میں سلوک بھی ایک "فلسفہ" تھا، اور ان کے خاص خاص نظریات

تھے، اور بڑے بڑوں کی خانقاہیں اور تکیے اب ایسے ایسے عقائد اور اعمال کے گہوارے بن چکے تھے، جن سے صحابہ و تابعین کے دور میں کوئی واقف نہ تھا، ملا جامی اسی فضا میں آنکھیں کھولتے ہیں، اسی ہوا میں سانس لیتے ہیں، اسی غذا سے نشو و نما حاصل کرتے ہیں، اور اس کے بعد اپنے قلم کو گردش دیتے ہیں، شیخ ابن عربیؒ کے رنگ میں رنگے ہوئے ان کے فلسفہ وحدت الوجود میں ڈوبے ہوئے، اس پر بھی جب قدم اٹھاتے ہیں تو جادۂ شریعت سے باہر نہیں پڑنے دیتے ہماری کتاب میں بس ایک مسئلہ توحید باری اور اسی کے متعلقات کو مختلف پیرایوں میں مختلف تعبیروں کے ساتھ ادا کرتے ہیں، اور بدعات مشائخ میں سے کسی ایک کے بھی ذکر کی ہمت نہیں پاتے، موضوع نہایت نازک و متین ہے، انداز بیان اتنا مؤثر ہے کہ پڑھنے والے پر ایک ہنگامی کیفیت تو فنائیت کی طاری ہو کر رہتی ہے،

آغاز کلام میں زبان قلم یوں زمزمہ سنج ہوتی ہے:۔

"خدا وندا، سپاس تو بزبان نمی آریم و ستایش تو بر تو نمی شماریم، ہر چہ از صحائف کائنات از جنس آئینہ و محامد ست ہمہ بر جناب عظمت کبریائی تو عاید ست، از دست و زبان ما چہ آید کہ سپاس و ستایش ترا شاید تو چنانی کہ خود گفتہ و گوہر ثنائے تو آن ست کہ خود سفتہ ؎

آنجا کہ کمال کبریائے تو بود — عالم نمے از بحر عطائے تو بود
ما را چہ حد حمد و ثنائے تو بود — ہم حمد و ثنائے تو سزائے تو بود

مناجات اور طلب توفیق میں متعدد رباعیاں لکھی ہیں، مثلاً ؎

(۱) یارب دل پاک و جان آگاہم دہ — آہ شب و گریۂ سحر گاہم دہ
روئے دل من صرف کن از ہر جہتے — آنگہ بخود ز خود بخود راہم دہ

(۲) یارب ہمہ خلق را بہ من بدخو کن — از جملہ جہانیاں مرا یکسو کن
روے دل من صرف کن از ہر جہتے — از عشق خودم یکجہت و یکرو کن

تمہید اور مطلب و اغراض تالیف کے ذیل میں فرماتے ہیں:-

ایں رسالہ ایست مسمیٰ بہ لوائح
درمیان معارف و معانی کہ بر
الواح اسرار و ارواح ارباب
عرفان و اصحاب ذوق و وجدان
لائحہ گشتہ بہ مجاہدات لائقہ و
اشارات رائقہ متوقع کہ وجود
متصدی ایں بیان را درمیان
نہ بینند و بر بساط اعراض و سماط
اعتراض نشینند، چہ او را دریں
گفتگو نصیبے بجز منصب ترجمانی
نے، و بہرۂ غیر از شیوۂ
سخن رانی نے ؎

اس رسالہ کا نام لوائح ہے، اس میں
ان معانی و معارف کا بیان ہے
جو ارباب عرفان و اصحاب ذوق
و وجدان کے قلوب، و ارواح
پر روشن ہوئے، اور جنھیں یہاں
الفاظ مناسب و اشارات دلکش
کے ساتھ قلمبند کیا گیا، امید ہے کہ
پڑھنے والے یہاں بیانات کے
شارح کی شخصیت کا خیال درمیان
میں نہ لائیں گے اور اعراض و نکتہ چینی
سے محترز رہیں گے، اسلئے کہ مصنف کا
منصب اس کتاب میں محض ترجمانی
کا ہے، اسکی حیثیت ایک حوالہ سے
زاید مطلق نہیں ؎

من ہیچم و کم ز ہیچ ہم بسیارے — میں ہیچ بلکہ ہیچ سے بھی بہت کم ہوں ایسے
از ہیچ و کم از ہیچ نیاید کارے — ہیچ اور کمتر از ہیچ سے ہو ہی کیا سکتا ہے،
ہر سر کہ ز اسرار حقیقت گویم — یہ جو اسرار حقیقت میں بیان کرتا ہوں انکا صرف
زانم بہ بود بہرہ بجز گفتارے — ناقل و ترجمان ہی ہوں اس سے زائد کچھ نہیں

اب لوائح کے لائحے شروع ہوتے ہیں،

(۱) لائحہ اوّل، اس بیان میں ہے کہ عالم و مافی العالم سے قطع نظر کر کے خدائے دو جہاں آفریں ہی کی طرف بہ کمال یکسوئی متوجہ رہنا چاہیئے،

ما جعل اللّٰہ لرجل من قلبین فی جوفہ، حضرت بیچون کہ ترا نعمت ہستی دادہ است در درون تو جز یک دل ننہادہ ست تا در محبت او یک رو باشی و یک دل، و از غیر او معرض و بر و مقبل، نہ آنکہ یک دل را صد پارہ کنی و ہر پارہ در پے مقصدے آوارہ ؎

اے آنکہ بہ قبلۂ بتاں دوست ترا — بر مغز چرا حجاب شد پوست ترا
دل در پے این و آں نہ نیکوست ترا — یک دل داری بس ست یک دوست ترا

(۲) لائحہ دوم، اس حقیقت کے بیان میں ہے کہ مخلوق سے دل لگانا ہی طبیعت میں پراگندگی و انتشار کا باعث ہوتا ہے، اور اگر وصرف خالق داور ہی سے لگی رہے، تو جمعیت خاطر و یکسوئی بھی تمامتر میسر رہے،

"تفرقہ عبارت ازاں ست کہ دل را بہ واسطۂ تعلق بامور متعددہ پراگندہ سازی، و جمعیت آنکہ از ہمہ بہ مشاہدہ واحد پردازی، جمعے گمان بردند کہ جمعیت در جمع اسباب است در تفرقہ ابد ماندند و فرقہ بہ یقین دانستند کہ جمع اسباب تفرقہ ست از ہمہ افشاندند، ؎

اے سالک رہ سخن ز ہر باب مگوے — جز راہ وصول رب ارباب مپوے
جوں علت تفرقہ ست اسباب جہاں — جمعیت دل ز جمع اسباب مجوے

(۳) لائحہ سوم کی تعلیم ہے کہ خدا ہر جگہ موجود ہے اور ظاہر و باطن ہر حال میں نگراں،

زہے خسارت کہ تو دیدہ از — پس کیسے افسوس کی بات ہے کہ
لقائے او بر داشتہ سوئے دیگر — تو اسکے دیدار کو چھوڑ کر دوسروں کی

می نگرے وطریق رضائے او	جانب نظر رکھتا ہے اور اس کی
بگذاشتہ راہ دیگرمی سپری ؎	خوشنودی کے راستہ کو چھوڑ کر دوسرے
	کی راہ طے کر رہا ہے ؎
بایار بہ گلزار شدم رہگزری	میں (عاشق) ایکدن محبوب کیساتھ سیر گلشن کو گیا
بر گل نظرے نگندم از بیخبری	اور وہاں نی حماقت سے پھولوں کو دیکھنے لگا
دلدار بطعنہ گفت شرمت بادا	اس نے چڑھاکر کہا شرم نہیں آتی کہ میرے رخسار کے
رخسار من اینست تو در گل نگری	ہوتے ہوئے آپ نگاہ پھولوں پر دوڑا رہے ہیں

(۴) لائحہ چہارم کا حاصل ہے، کہ ماسوائے حق جو کچھ ہے، زوال پذیر و فانی ہو، باقی صرف ذات حق ہو، اسکے سوا ساری امیدیں اور آرزوئیں لغو وموہوم ہیں،

(۵) لائحہ پنجم، کائنات کی ساری جلوہ آرائیاں اسی جمیل مطلق کا پرتو ہیں، دنیا میں اگر کوئی دانا ہے، تو اس پر اسی کی ذات کا پرتو ہے، اگر کوئی بینا ہے تو اسی کے عکس کی تجلی ہے، غرض دنیا میں جتنے بھی کمالات واوصاف سمجھے جاتے ہیں سب اسی کے مظاہر واظلال ہیں اور اسی کل اور مطلق نے اوج کلیت واطلاق سے تنزل کر کے اپنی تجلیات کو جزئیت وتقید میں رونما کیا،

(۶) لائحہ ششم میں انسان کی حقیقت بیان کی ہے کہ

آدمی اگرچہ بہ سبب جسمانیت	آدمی اپنی جسمانیت کے لحاظ سے
در غایت کثافت ست اما بہ	غایت کثافت میں ہے، لیکن اس
حسب روحانیت در نہایت	طرح بہ اعتبار روحانیت
لطافت، بہرچہ روئے آرد	انتہائے لطافت میں اب وہ
حکم آں گیرد، وبہرچہ توجہ	جس طرف بھی توجہ کریگا وہی
کند رنگ آں سر برزند، بس	رنگ اس پر چھا جائے گا، تو اے

می باید کہ بہ کوشی و خود را
از نظر خود بپوشی، و بر ذاتی
اقبال کنی و بہ حقیقی اشتغال نمائی
کہ درجات موجودات ہمہ مجالی
جمال اویند و مراتب کائنات
مرائی کمال او، و بریں نسبت چندان
مداومت نمائی کہ با جان تو در آمیزد
و ہستی تو از نظر تو برخیزد اگر خود
روے آوری روے بہ او آوردہ
باشی چوں از خود تعبیر کنی تعبیر از
وے کردہ باشی مقید مطلق شود
و انا الحق ہو الحق،

طالب تجھے لازم ہے کہ تو اپنے
کو اپنے سے مخفی کرے، اور جو ہستی
ذاتی و حقیقی ہے، بس اسی کی جانب
مشغول و متوجہ ہو جا، اس لئے کہ
موجودات کی جتنی بھی قسمیں ہیں
سب اسی کے جمال کی تجلیات ہیں
اور کائنات کے جتنے بھی اجزاء
ہیں، سب اسی کے کمال کا آئینہ،
تو اپنی اس نسبت کو مشق و ریاضت
سے اس درجہ تک پہونچا دے کہ وہ
ہستی حقیقی تجھ تک مدغم ہو جائے
اور خود تیری ہستی تیری نظروں سے
غائب ہو جائے، یہاں تک کہ تو
اگر اپنا خیال کرے تو عین اسی کا
خیال کرے، اگر تو اپنا ذکر کرے
تو عین اسی کا ذکر کرے اور اس
طرح مقید مطلق ہو جائے اور انا الحق
ہو الحق کے حکم میں داخل ہو جائے،

(۷) لائحہ ہفتم سے عملی طریقوں کی تعلیم شروع ہوتی ہے، اس لائحہ میں تعلیم یہ ہے کہ ذکر الہٰی اور نسبت حق سے کوئی حالت خالی اور وقت کا کوئی لمحہ ضائع نہ گذرنا چاہیئے۔

"ورزش ایں نسبت شریفہ می باید کرد بر وجہے کہ ہیچ وقت از اوقات و ہیچ حالتے از حالات ازاں نسبت خالی نہ باشی چہ در آمدن وچہ در خوردن و خفتن وچہ در شنیدن و خفتن و بالجملہ در جمیع حرکات و سکنات ما فراغت می باید بود تا بہ بطالت نہ گزرد۔"

(۸) لائحۂ ہشتم، جس طرح وقت کو تمامتر ذکر الٰہی سے مشغول و معمور رکھنا چاہیئے اسی طرح قلب کو بھی کوشش کر کے تعلقات دنیوی سے منقطع کر لینا چاہیئے۔

(۹) لائحۂ نہم، اس میں فنا اور فنائے فنا کی تعریف بیان کی ہے،

"فنا عبارت ازاں ست کہ بواسطۂ استیلائے ظہور ہستی حق بر باطن بما سوائے او شعور نماند و فنائے فنا آنکہ بآں بے شعوری ہم شعور نماند و پوشیدہ نہ باشد کہ فنائے فنا مندرج است زیرا کہ صاحب فنا را اگر بہ فنائے خود شعور باید، صاحب فنا نہ باشد بہ جہت آنکہ صفت و موصوف آں از قبیل ما سوائے حق اند سبحانہ و تعالیٰ پس شعور بآں منافی فنا باشد۔"

(۱۰) لائحۂ دہم، توحید کی تعریف بیان کی ہے،

توحید یگانہ گردانیدن دل ست	وہ ماسوائے حق سے دل کے ہر قسم
یعنی تخلیص و تجرید از تعلق بماسوائے	اور ہر نوعیت کے ترک تعلق اور قطع
حق ہم از روئے طلب و ارادت	وابستگی کا نام ہے، اور وہ طلب ارادت،
دہم از جہت علم و معرفت،	علم و معرفت سب پر شامل ہے،

(۱۱) لائحۂ یازدہم، کا حاصل ہے کہ انسان پر نفس کی خواہشیں جس وقت غالب ہیں، اس نسبت مع اللہ کو ہر وقت ملحوظ رکھنا لازمی ہے، جوں جوں علائق کی بیڑیاں پیر سے کٹتی جائیں گی، مجاہدوں اور ریاضتوں میں لطف آنے لگے۔

(۱۲) لائحۂ دوازدہم کا خلاصہ یہ ہے کہ مجاہدات میں جوں جوں لذت جائیگی انسان اس نسبت، مع اللہ کی تربیت وتقویت میں طبعاً زیادہ مصروف ہوتا جائے گا،

(۱۳) لائحۂ سیزدہم حقیقت حق تعالیٰ میں ہے:-

حقیقت حق سبحانہ وتعالیٰ جبر ہستی نیست وہستی اور اانحطاط دہستی نے۔ مقدس از سمت تغیر وتبدل ومبرا است از سمت تکثر وتحول۔ از ہمہ نشانہا بے نشان نہ در علم گنجد ونہ در عیان	حق تعالیٰ کی حقیقت تمام تر اس کی ہستی ہے، ایسی ہستی جس میں کسی ہستی کی گنجائش نہیں، نہ اس میں تغیر وتبدل کا امکان ہے، نہ تعدد وتکثر کا گمان، سارے حدود وقیود سے بالاتر، عقل وحواس دونوں اسے اپنی گرفت میں لانے سے معذور

(۱۴) لائحہ چہاردہم، لفظ وجود کے معنی بیان کئے ہیں،
ایک، تحقق اور حصول، اور یہ حکماء ومتکلمین کی اصطلاح ہے،
دوسرے، حقیقت قائم بالذات، یہ اہل عرفان وصوفیہ کی اصطلاح ہے اور اس معنی میں یہ لفظ ذات حق کے مرادف ہے،

(۱۵) لائحۂ پانزدہم، معنی صفات کی تحقیق میں ہے، صفات ایک معنی میں غیر ذات ہیں اور ایک معنی میں عین ذات،

صفات غیر ذات اند من حیثیت مالفہمہ العقول، وعین ذات اند من حیث التحقق والحصول مثلاً عالم ذات است بہ اعتبار	عقلی تحلیل میں تو صفات بیشک ذات سے الگ ہیں، لیکن تحقق وحصول کے لحاظ سے تو عین ذات ہیں، مثلاً عالم اس ذات کا نام ہے

صفت علم و قادر به اعتبار قدرت	جس میں صفت علم ہو، قادر
و مرید به اعتبار ارادت و شک	اس ذات کا جس میں صفت
نیست که اینہا چنانکه به حسب	قدرت ہو، مرید اس ذات کا
مفہوم بایکدیگر متغائر اند	جس میں صفت ارادہ ہو، اور
مر ذات را نیز متغائر اند اما به	یہ یقینی ہے کہ جس طرح یہ صفات
حسب تحقق به حسب تحقق و ہستی	باہم متغائر ہیں، اسی طرح ذات
عین ذات که اند که آنجا	سے بھی الگ ہیں، لیکن ان کا
وجود ذات متعدد نیست بلکه	تحقق تو عین ذات ہی میں ہو،
وجود جہت واحد،	اس سے باہر ان کا وجود ہی نہیں،

(۱۶) لائحہ شانزدہم میں اس حقیقت کی ترجمانی ہے، کہ ذات بحیثیت ذات تمام اسماء وصفات و اضافات سے معری ہے، لیکن اپنے ظہور و شہود میں ان سب سے متصف ہو تی جاتی ہے، اور جوں جوں تجلیات میں کثرت پیدا ہوتی جاتی ہے، یہ اتصاف بھی بڑھتا جاتا ہے،

(۱۷) لائحہ ہفتدہم، یہ لائحہ بہت مفصل ہے، اس میں مراتب تعینات اور ذات واحد کے غنائے مطلق پر دقیق پیرایہ میں گفتگو ہے، خاتمہ کے چند شعر سننے کے قابل ہیں ؎

(۱) دامان غنائے عشق آمد آمد پاک — زآلودگی نیاز باشتی خاک
جوں جلوہ گر و نظارہ گر جملہ خود است — گرما و تو درمیاں نہ باشیم چہ باک

(۲) واجب زوجود نیک بد مستغنی ست — واحد زمراتب عدد مستغنی ست
در خود ہمہ را بجو جاوداں می بیند — از دید نشان برون زخود مستغنی است

(۱۸) لائحہ ہیژدہم، ہر نوع حیوانی کے افراد کے تشخصات اور تعینات کو الگ کر کے

اگر دیکھا جائے، تو افراد کے لئے اسم مشترک اسی نوع حیوانی کا نکلے گا، پھر اب جتنی انواع حیوانی ہیں، ان کے ممیزات کو دور کیا جائے، تو اب اسم مشترک "حیوان" رہے گا، اب حیوانات اور اجسام خاص کے دوسرے انواع کے ممیزات کو اگر حذف کیا جائے، تو حقیقت مشترک "جسم" باقی رہے گی، اب یہی عمل تحلیل اگر جسم اور دیگر انواع جوہر کے تشخصات کے ساتھ کیا جائے، تو "جوہر" باقی رہ جائے گا، جوہر اور اعراض کے ممیزات بھی اگر حذف کر دئے جائیں، تو اسم مشترک "ممکن" پڑے گا، اب ممکن و واجب کے ممیزات کی بھی تحلیل کر دی جائے، تو سب سے آخر میں "وجود مطلق" باقی رہے گا، اور یہی تمام ذوات وصفات کا منتہی ہے سے

تا چند حدیث جسم و ابعاد و جہات — تا کے سخن معدن و حیوان و نبات
یک ذات فقط بود محقق نہ ذوات — ایں کثرت وہمی ز شئون ست و صفات

(۱۹) لائحہ نوزدہم، یہ شئون و تجلیات جو ذات واحد میں مندرج ہیں، انکے اندراج کی وہ صورت نہیں ہوتی، جو کل میں جزو کے ظرف میں مظروف کے اندراج کی ہوتی ہے، بلکہ وہ صورت ہوتی ہے، جو موصوف و ملزوم میں، اندراج اوصاف ولوازم کی ہوتی ہے۔ جیسے ایک کے عدد میں شمول، اندراج اس کے نصف اور ثلث اور ربع وغیرہ کسرات الیٰ غیر النہایۃ کا ہوتا ہے۔

(۲۰) لائحہ بستم، وجود مطلق کی حقیقت بجائے خود بدستور اور غیر متغیر رہتی ہے، خواہ وہ اپنے ظہور کے لئے جو بھی قالب اور شئون و اعتبارات کے طور پر جو بھی مظاہر اختیار کرے، ــــــ آفتاب کے نور سے پاک و ناپاک، دونوں منور ہوتے ہیں، آفتاب خود پاک یا ناپاک کچھ بھی نہیں ہوتا۔

(۲۱) لائحہ بست و یکم، عام قاعدہ یہ ہے کہ

مطلق بے مقید نہ باشد و مقید بے مطلق صورت نہ بندد، امّا مقید محتاج است بہ مطلق، و مطلق مستغنی ست از مقید، پس استلزام از طرفین ست و احتیاج از یک طرف،

مطلق بغیر مقید کے نہیں پایا جاتا، اور مقید بغیر مطلق کے صورت نہیں اختیار کرتا، لیکن مقید محتاج ہوتا ہے مطلق کا، اور مطلق مستغنی ہے مقید سے، پس لزوم و استلزام تو دونوں جانب سے ہے لیکن احتیاج صرف مقید کی جانب سے ہے،

(۲۲) لائحہ بست و دوم، اس کا لب لباب اس رباعی میں آگیا ہے،

همسایہ و همنشیں و همرہ همہ اوست در دلق گدا و اطلس شہ همہ اوست
در انجمن فرق و نہانخانہ جمع باللہ همہ اوست ثم باللہ همہ اوست

(۲۳) لائحہ بست و سوم حقیقت وجود اگرچہ تمام مظاہر میں مشترک ہے، پھر بھی مراتب و شئون میں بڑا تفاوت ہے، بعضہا فوق بعض، اور ہر مرتبہ کے لئے الگ الگ اسماء و صفات و اعتبارات مخصوص ہیں، مرتبۂ الوہیت و ربوبیت کے اعتبارات اور ہیں اور مرتبہ عبودیت و خلقیت کے اور سب کو متحد کر دینا عین کفر و زندقہ ہے،

اے بردہ گمان کہ صاحب تحقیقی داند رصفت صدق و یقین صدیقی
ہر مرتبہ از وجود حکمے دارد گر حفظ مراتب نہ کنی زندیقی

(۲۴) لائحہ بست و چہارم، وجود حقیقی کے مراتب حد شمار سے خارج ہیں، اس پر جب اطلاق اور لاتعین کے پہلو سے نظر کی جائے، تو اس کا ادراک نہ کوئی عقل کر سکتی ہے، نہ کسی کشف کی رسائی اس تک ہو سکتی ہے، علم و عقل،

کشف و شہود سب اس مرتبۂ آخری کے ادراک و عرفان سے عاجز ہیں ؎

ہر چند کہ جانِ عارف آگاہ بود — کے در حرم قدس تو اش راہ بود
دست ہمہ اہل کشف وارباب شہود — از دامن ادراک تو کوتاہ بود

(۲۵) لائحہ بست و پنجم، حقیقت الحقائق اپنی ذات میں واحد ہے، شمار و عدد کا وہاں گذر نہیں، لیکن بہ لحاظ تجلیات و شئون کثیر و متعدد ہے، تعین و وحدت کے لحاظ سے اُسے حق سے موسوم کرتے ہیں، اور بہ لحاظ ظہور، تعدد یہی خلق ہے، ظہور و بطون، ازلیت و آخریت، سب اسی کے نسب و اعتبارات ہیں، اور یہی معنی ہیں آیہ کریمہ ھوالاول والآخر والظاھر والباطن کے۔

(۲۶) لائحہ بست و ششم، اس میں شیخ ابن عربیؒ کے اس قول کی شرح ہے کہ عالم عبارت ہے ان اعراض سے جو عین واحد میں کہ حقیقت ہستی ہے، مجتمع ہو گئے ہیں، اور ان میں ہر لحظہ اور ہر آن تجدد و تبدل ہوا کرتا ہے، جیسا کہ آیہ کریمہ سے مترشح ہوتا ہے، بل ھم لبس من خلق جدید،

(۲۷) لائحہ بست و ہفتم، جمال وحدت حقیقی کے حق میں عظیم ترین حجاب اور کثیف ترین نقاب اس کے یہی تقیدات و تعینات ہیں، نظریں انھیں میں الجھ کر رہ جاتی ہیں ——— موجوں کے کھیل تماشہ میں دل ایسا نہیں جاتا ہے، کہ سمندر کی موجودگی کا احساس ہی جاتا رہتا ہے ؎

بحریست وجود جاودان موج زنان — زان بحر ندیدہ غیر موج اہل جہان
از باطن بحر موج بین گشتہ عیان — بر ظاہر بحر، بحر در موج نہان

(۲۸) لائحہ بست و ہشتم، حقیقت ہستی اپنے جمیع شئون و صفات، نسب و اعتبارات کے ساتھ ہر موجودگی حقیقت میں شامل و ساری ہے، شیخ محمود شبستری صاحب گلشن راز اسی مسئلہ کو یوں بیان کرتے ہیں ؎

دل یک قطرہ را اگر بر شگافی بر موج آید از دصد بحر صافی

(۲۹) لائحہ بست و نہم، مظاہر سے جو فعل صادر ہوتے رہتے ہیں، ان کے صدور کا انتساب از روئے صورت ان مظاہر کی جانب، صحیح ہے، لیکن نہ از روئے حقیقت کہ نفس الامر میں سب کا انتساب صرف اسی ذات واحد کی جانب صحیح ہوسکتا ہے کہ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے، واللہ خلقکم وما تعملون

(۳۰) لائحہ سی ام، ہر امر وجودی بجائے خود خیر محض ہے، جس عمل میں شر وذم کا پہلو نکلتا ہے، وہ کسی فعل وجودی کا بجائے خود نتیجہ نہیں، بلکہ اس اعتبار سے ہے کہ ایک فلاں امر وجودی نے دوسرے امر وجودی کو معدوم کر دیا —— زید اگر بکر کو قتل کر ڈالتا ہے تو یہ واقعہ اپنے اثباتی یا ایجابی پہلو یعنی زید کی قابلیت قتل کے لحاظ سے مذموم نہیں، بلکہ اپنے عدمی وسلبی پہلو سے مذموم ہے، یعنی اس اعتبار سے کہ اس نے بکر کی حیات کو مرتبہ تکمیل تک نہ پہونچنے دیا،

(۳۱) لائحہ سی ویکم، اس میں شیخ صدر الدین قونوی کے ایک قول کی شرح کی ہے، اور یہ بتایا ہے کہ علم تابع ہے وجود کے، ہر حقیقت وجودی کے لئے ایک علم ہے، اور جو تفاوت حقائق وجود میں ہے، اسی کے متناسب تفاوت علم بھی رہتا ہے،

(۳۲) لائحہ سی ودوم جس طرح ہستی مطلق کی حقیقت، کائنات کی ہر ذات میں شامل ومندرج ہے، اسی طرح اس کے صفات بھی جملہ صفات موجودات میں جاری وساری ہیں۔

(۳۳) لائحہ سی سوم، اصل عبارت:-

"حقیقت ہستی ذات حق سبحانہ وتعالیٰ اشئون ونسب واعتبارات آن صفات اود اظہار اومر خودش را متلبۃ بہذہ النسب والاعتبارات

فعل تا ثیرا و تعینات ظاہرہ مرتبہ علیٰ ہذ الاظہار آثار او"

(۱۴۳) لائحہ سی وچہارم، حضرت حق کی تجلیات دو ہیں، ایک غیبی، اسکو صوفیہ فیض اقدس سے موسوم کرتے ہیں، دوسرے شہودی وجودی، اسکا اصطلاحی نام فیض مقدس ہے،

دامن تجلی ثانی مترتب بر تجلی اول ست ومظہر ست بر کمالاتے راکہ بہ تجلی اول در قابلیات واستعدادات اعیان اندراج یافتہ بود،

یہ دوسری تجلی اسی پہلی تجلی پر مترتب ہوتی ہے، اور جن کمالات کو تجلی اول نے درجہ قابلیت و استعداد میں مندرج رکھا تھا، ان کی یہ مظہر ہوتی ہے،

تاریخ تصوف کے بہت متاخر زمانہ کی بساط بھی نظروں کے سامنے پھر گئی. تصوف کی جگہ اب فلسفہ تصوف لے چکا ہے، اصطلاحیں تمام باہر والوں کی پھیل گئی ہیں، یہ سب ہے، لیکن گفتگو وہی توحید ہی پر جاری ہے، مشرکانہ خیالات، نیم مشرکانہ بدعات ورسوم کا نام بھی شروع سے آخر تک نہیں آنے پاتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سارا فن توحید ہی سے شروع ہوتا ہے، اور توحید ہی پر ختم ہو جاتا ہے،

(۹) فقر محمدی

پرانے مشائخ طریقت میں ایک بزرگ شیخ احمد بن ابراہیم الواسطی گذرے ہیں، جن کو شیخ عبد الحق دہلویؒ "عالم عامل" اور "عارف کامل" کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں اور شہادت دیتے ہیں کہ

از کبار مشائخ دیار عرب بود و	عرب کے مشہور مشائخ میں سے
مقتدائے روزگار و در طریق اتباع	تھے اور اپنے زمانہ کے پیشوا اور
سنت و تقویم و ترویج ایں طریقہ	پیروی سنت رسولؐ اور اس کے
بے نظیر وقت خود بود،	پھیلانے میں اپنے زمانہ میں بے نظیر تھے،

ان بزرگ کا عربی میں ایک رسالہ الفقر المحمدی کے نام سے ہے، شیخ دہلویؒ کو ایک نسخہ اس کا ہاتھ لگ گیا، اس کا فارسی ترجمہ انھوں نے تحصیل الکمال لابدی باختیار الفقر المحمدی کے نام سے کر دیا، جو ان کے مجموعۂ رسائل و مکتوبات میں نمبر پانچ پر شائع ہوا ہے، آج تصوف کے بہت سے دشمن اور مخالفین اور بہت سے دوست و موافقین، اس کو شریعت اسلام سے علیحدہ کوئی مستقل نظام سمجھ رہے ہیں، ان دونوں گروہوں کے حق میں شاید اس کے بعض مطالب کا مطالعہ مفید ہو، ترجمہ لفظی نہیں حاصل ہے عنوانات میرے اضافہ کئے ہوئے ہیں، اور مضامین کی ترتیب بھی میری ہی قائم کی ہوئی ہے،

تصوف کا اصل اصول اگر سچی درویشی اور اصلی فقیری کی طلب ہے، جس کی جڑ مضبوط جس کی شاخیں بلند ہوں تو لازم ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کی فقیری اور درویشی کو اختیار کرو، اور انہی کی پیروی کرو کہ صاف اور پاکیزہ پانی وہیں ملتا ہے، جہاں سے چشمہ پھوٹتا ہے، اور بعد کے آنے والوں کی درویشی نہ اختیار کرو، کہ پانی سرچشمہ سے دور جاکر گندلا ہوجاتا ہے، اور اس کا رنگ اصلی قائم نہیں رہتا ہے،

اس مسلک کا انجام اس طریقۂ محمدی پر اگر قائم رہے تو امید ہے کہ اگلوں سے جا ملو گے، جو پیغمبر خدا کے اصحاب میں تھے، قیامت کے روز پیمبر کے جھنڈے کے نیچے پیمبر اور یاران پیمبر کے ساتھ تمھارا حشر ہوگا، یہ وہ وقت ہوگا کہ دوسرے اپنے شیوخ اور مرشدوں کے جھنڈوں کے نیچے ہونگے لیکن تمھارے اوپر اس وقت تمھارے شیخ یعنی حضور رسول صلی اللہ وسلم کے جھنڈے کا سایہ ہوگا،

تصوف کے معنی لوگوں کی زبان پر آج فقر، فقر ہے، لیکن اس کی حقیقت سے بہت کم لوگ واقف ہیں، نہ یہ جانتے ہیں کہ اس کی ابتدا کہاں سے ہوتی ہے، اور نہ یہ خبر ہے کہ اس کی انتہا کیا ہے، اگر فقر کے معنی سمجھ میں آجائیں اور اس کے ابتدائی مدارج کا علم ہوجائے تو اس پر اس کی انتہا کا بھی قیاس کیا جاسکتا ہے، فقر کے میدان میں قدم رکھنا صرف اسی وقت ممکن ہے کہ جب، ممنوعات سے بچنے اور احکام کی تعمیل پر قدرت حاصل ہولے۔

لازمی شرطیں اس رنگ میں ڈوبنے کے لئے پہلی شرط یہ ہے، جس طرح اپنے جسم کو گناہ سے محفوظ رکھتا ہے، اسی طرح فقیر اپنے دل کو خیالی گناہ سے محفوظ رکھے، اور اگر دل میں کبھی کوئی خطرہ پیدا ہو، تو فوراً اس سے توبہ کرے، فقیر ایسے بھی ہوتے ہیں، جن کے دلوں میں مرضی الٰہی کے خلاف کسی خطرہ کا گذر ہی نہیں ہوتا۔ انھیں اس امر کی شرم ہوتی ہے، کہ خدا کی دوستی کا دعویٰ کرکے کسی

غیر خدائی خیال کو دل میں آنے دیں، یہ فقر کا ابتدائی مرتبہ ہے، جب تک یہ قدرت نہ حاصل ہو جائے، زبان پر فقیری کا نام لاتے ہوئے بھی شرمانا چاہیئے۔

گناہ سے بچنے، احکام کی پابندی کرنے، اور دل کو خطرات دوساوس سے محفوظ کر لینے کے بعد فقر کے لئے دوسری شرط یہ ہے کہ خدا کی طلب اور محبت دل پر اتنی غالب ہو جائے کہ دنیا کے تمام فوائد و منافع بالکل جل جائیں اور ان کا خیال تک نہ آنے پائے، دل کو محض محبوب حقیقی و مطلوب اصلی کے لئے مخصوص ہو جانا چاہیئے، اور ماسویٰ سے بالکل خالی ہو جانا چاہیئے جب تک، یہ کیفیت نہ طاری ہو جائے، فقیری کا دعویٰ کرنے سے شرمانا چاہیئے۔

کاملین کا مرتبہ اوپر جو شرطیں بیان کی گئیں، یہ مبتدیوں کے لئے ہیں، جب دل کو انھیں کے سننے کی تاب نہیں، اور ان پر عمل کی توفیق نہیں تو پھر کاملین کے مرتبۂ کمال کو وہ کیونکر سمجھ سکتا ہے، اور اس کی تشریح اس مختصر رسالہ میں کیسے کی جاسکتی ہے، صرف ان کے مرتبہ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے،

جھوٹے مدعی رونے کا مقام ہے کہ ہم میں ایسا گروہ پیدا ہو گیا ہے، جو حرام کھاتا ہے اور باطل میں مشغول رہتا ہے، جو ان لوگوں کو مل جائے وہی ان کے نزدیک حلال ہے، اور جو نہ ملے وہ حرام ہے، دن رات انھیں یہ دھن سوار رہتی ہے کہ لذیذ غذائیں کھانے کو اور خوبصورت چہرے دیکھنے کو اور نغمہ کی آوازیں سننے کو ملتی رہیں۔ اور اس دھن میں یہ بڑے بڑے دعوے نکالتے ہیں اور اپنے میں وجد و حال ظاہر کرتے ہیں، تاکہ عوام ان کے معتقد ہوں اور انھیں دنیا کچھ اور ہاتھ آئے، ان کو نہ حلاوت اسلام سے واسطہ اور نہ لذت ایمان سے سروکار، ساری ساری رات رقص و سماع میں مصروف رہتے ہیں اور نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں، تو گویا ٹکریں مار کر اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں، اور امیروں اور بادشاہوں کے یہاں آمد و رفت

اور ان سے نذریں حاصل کرنے پر فخر کرتے ہیں خدا تعالیٰ ان کے شر سے بچائے کہ دنیا کے رہزنوں سے کہیں بڑھ کر دین کے رہزن ہیں، دنیا کا رہزن مال لیجاتا ہے، اور یہ دولتِ ایمان پر ہاتھ صاف کرتے ہیں لوگوں پر انکے لباس فقر کا اثر پڑتا ہے اور وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ فقیری اسی کا نام ہے،

سچے فقیر کی علامات محمدی فقیروں کی ایک علامت یہ ہے کہ وہ قرآن کریم کے ذوق سے مست رہتے ہیں، اس کی آواز پر وجد کرنے لگتے ہیں، اور اس کے سننے کے وقت ان پر خود متکلم (یعنی خدا) کی تجلیوں کا ظہور ہونے لگتا ہے، کیسے غضب کی بات ہے کہ جس محبوب کی محبت کا دعویٰ کیا جائے، اسی کے کلام میں لطف نہ آئے اور اس کے لئے طبیعت حاضر نہ ہو، اور لطف آئے تو شعر و قصیدہ پر، گانے بجانے اور تالیوں پر!

سماع اور قرآن اللہ کے دوستوں اور عاشقوں کے لئے ساری لذت حلاوت قرآن میں ہے، اور ان کی راحت و تسکین کا سامان اسی میں ہے، کلام کے ساتھ ان کا دل متکلم سے وابستہ ہو جاتا ہے، اور قرآن و حدیث، مواعظ و اخبار، وعد و وعید کو سنتے ہی ان کے دلوں میں گداز پیدا ہو جاتا ہے، اور متکلم کی ہستی میں وہ اپنی عظمت گم کر دیتے ہیں، اور جو یہ کہا جاتا ہے کہ شعر کو نہ کہ قرآن کو طبیعت بشری سے خاص مناسبت ہے، اس لئے اشعار کو سُن کر دل میں قدرۃً تحریک پیدا ہوتی ہے، سو یہ قول لغو و بے حقیقت ہے، اس لئے کہ شعر کے وزن اور موسیقی کے تال سُر پر حرکت کرنا جبلت حیوانی کا تقاضا ہے، چنانچہ حیوانات اور بچے سب اچھی موسیقی سے اثر قبول کرتے ہیں، یہ فطرت حیوانی ہے، انسان کی اعلیٰ فطرت کا درجہ اس سے کہیں بلند ہے، جن کے دلوں میں ایمان گھر کر چکا ہے، اور محبت الٰہی حلاوت حاصل کر چکی ہے، جیسا کہ حضرات صحابہؓ اور ان کے بعد

آنے والے کا حال تھا سو ان کے قلوب کو حرکت میں لانے والی اور ان کے شوق وجد، رقت، اور خشوع کو بڑھانے والی شے قرآن پاک کی سماعت ہی ہوسکتی ہے،

عملی ہدایات صحیح تصوف یا فقر محمدی میں قدم رکھنے والوں کے لئے عملی ہدایتوں میں سے پہلی شے یہ ہے،

اپنے پروردگار کے سامنے جس نے قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسی نعمتیں اتاری ہیں، صدق دل سے توبہ کرنا، پھر تنہائی میں جاکر، سب کی نظروں سے الگ، وضو کرکے دو رکعتیں پڑھنا، اس سے فارغ ہوکر ننگے سر، ہاتھ باندھے ہوئے اپنی خطاؤں پر نادم ہوکر اتنی دیر کھڑے رہنا کہ دل میں گدازپیدا ہوجائے، اور آنکھوں سے آنسو رواں ہوجائیں، اسوقت رو رو کے توبہ و استغفار کرنا، الفاظ حدیث کے مطابق سید الاستغفار پڑھنا پھر بطریق پیروی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قائم و مضبوط رہنے کے لئے توفیق چاہنا اور آئندہ کے لئے مضبوط عہد کرنا، کہ آنکھ، کان، زبان، شکم، شرمگاہ، اور ہاتھ پیر ہر قسم کے گناہ سے محفوظ رہیں گے، ایسا کہ جب دن ختم ہو تو نہ زبان کسی کی بدگوئی، جھوٹ، بدزبانی وغیرہ سے آلودہ ہوئی ہو، نہ کان نے کوئی بیجا بات سنی ہو، اور نہ آنکھ کسی ایسی چیز پر پڑی ہو جس کا دیکھنا شرعاً پسندیدہ نہ تھا، اور نہ خالق و مخلوق میں سے کسی کا حق اپنے اوپر باقی رہنے دے،

عملی ہدایات کی دوسری دفعہ یہ ہے کہ نماز با جماعت، اپنے ارکان و آداب حضور قلب وغیرہ کی پوری پابندیوں کے ساتھ ادا کی جائے، ایسی کہ حدیث میں جو لفظ "احسان" آیا ہے، اس کی پوری عملی تفسیر ہوتی رہے، حال صحیح وہی ہے، جو حالت نماز میں طاری ہو، بندہ اور پروردگار کے درمیان رابطہ پیدا کرنے والی شے نماز ہے، پس اگر نماز میں حضور قلب نہیں پیدا ہوتا تو ان کا کوئی حال معتبر

نہیں، اس لئے کہ جس بندہ کے حجابات ایسی منزل قرب میں بھی پہونچ کر دور نہیں ہوئے، اس کے لئے کسی دوسرے موقع پر اس کی کیا امید ہو سکتی ہے، حیف ہے کہ سماع شعر کے وقت تو قلب حاضر ہو لیکن جو وقت عین حضوری حق کا ہوتا ہے، اسی وقت غائب ہو، ایسی فقیری نا سزا اور ایسی درویشی ناجائز۔

بنیاد کار سچے تصوف کی بنیاد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت و ربط قلب پیدا کرنے پر ہے، اپنے دل کو اس ذات گرامی کی محبت میں اٹکایا جائے، اسی کو اپنا شیخ اور اپنا امام بنایا جائے، اسی کے نام پر بکثرت درود و صلوٰۃ بھیجا جائے اور اسی کے ساتھ پیوند محبت مستحکم کر لیا جائے، تمام درویشوں کو دیکھا ہوگا کہ ان کے دلوں میں، ان کے مرشدوں کی عظمت ایسی بیٹھ جاتی ہے کہ وہ جب کبھی اپنے شیخ یا مرشد کا نام سنتے ہیں تو بے چین ہو جاتے ہیں، یہی کیفیت، یہی نسبت قلب سچے درویش کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے ساتھ پیدا کر لینا چاہیئے، اپنا امام اور اپنا شیخ انہی کو بنانا چاہیئے، دل میں خیال آئے تو انھیں کا، آنکھوں میں صورت پھرتی رہے تو انہی کی، کان لذت حاصل کریں تو انہی کے نام مبارک سے، عظمت کا احساس ہو تو انہی کے ذکر سے، زبان انہی پر درود بھیجنے میں لگی رہے، دل میں ان ہی کے حالات سننے اور جاننے کا ذوق پیدا ہو، حدیث و آثار کے پڑھنے سے علاقہ محبت کو اور ترقی ہو، شوق و اشتیاق ہو تو انہی کا، یاد ہو تو انہی کی پیروی ہو تو انہی کی، ہر امر میں انہی کے حکم کی تعمیل اور پیروی کا شوق غالب ہو، اور ان کی پیروی میں اتنی شدت برتی جائے کہ ہر شخص دیکھتے ہی "محمدی" سمجھ لے۔

رسالہ کے اہم ضروری مطالب کا ملخص سطور بالا میں آگیا، شیخ عبدالحق دہلوی ان تمام مطالب کو نقل کر دینے کے بعد خود بھی ان کی پرزور تائید کرتے ہیں،

— اب اہل طریقت و اہل شریعت دونوں فرمائیں کہ کسی گروہ کو اس پر حرف رکھنے کی کوئی گنجایش ہے؟

ہمارے سچے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے دنیا کو یہ پیام پہنچا تھا کہ غیر مسلم اگر خدائے واحد و یکتا کی پرستش پر متفق ہو جائیں تو مسلمانوں سے فوراً صلح ہو سکتی ہے، اگر آج سارے اسلامی فرقے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم رحق کی محبت و اطاعت کے مرکزی نقطے پر رجوع ہو جائیں تو آپس کی رنجش و نقیض رد و کد کے لئے کوئی گنجایش رہ جاتی ہے؟

ضمیمہ
مرشد کی تلاش

(منقول از سچ، بعد نظر ثانی کامل)

خیرآباد (ضلع سیتاپور اودھ) سے ایک صاحب کا بہت طویل مراسلہ مہینوں سے آیا ہوا پڑا ہے، دوسرے مضامین کے ہجوم نے اب تک توجہ نہ کرنے دی (اور یہ سچ اور صدق کی تاریخ میں کوئی بات نہیں) مراسلہ کا زیادہ ضروری حصہ حسب ذیل ہے،

"مدت سے میں ایک ضمیری الجھن میں مبتلا ہوں، کوئی روحانی طبیب مجھے ملتا نہیں، بحیثیت مسلمان پیری مریدی سے متعلق آپ کے حقیقت آگیں خیالات سے مستفیض ہونا چاہتا ہوں، خوش نصیبی یا بدنصیبی سے میرے خاندان میں دونوں شغل ہوتے ہیں، مجھے اب تک کسی اللہ والے سے نسبت ارادت حاصل نہیں۔

اسلامی نقطۂ نظر سے پیری مریدی کے اغراض و مقاصد کیا ہیں؟ ملت مرحومہ کے لئے من حیث الاسلام یہ کہاں تک لازمی ہے؟ کیا قرن اول میں جو اسلام کا عہد سعادت تھا اس کی مثالیں ملتی ہیں؟ عہد نبوت و عہد صحابہ کے بعد دورِ تابعین میں بھی کیا پیری مریدی کی یہ کثرت، اور

غیر خوش آیند بہتات تھی؟ تمسک بالکتاب والسنۃ کے بعد کیا یہ بھی لازمی ہے کہ کسی رسمی پیر کی پیروی کی جائے؟ ایک مسلمان طاعات الٰہیہ کا پابند، اللہ سے ڈرتا ہے، سچ بولتا ہے، مشائخ کرام وصلحائے امت کا ادب و احترام رکھتا ہے، لیکن عرف عام میں مرید نہیں؟ کیا عند اللہ وہ اس کا بھی ذمہ دار ہے؟ اگر بیعت کا مقصد دعوت الی الحق، رشد وہدایت وغیرہ ہے، تو آج کل پیروں کی جماعت عموماً یہ خدمت کہاں تک انجام دے رہی ہے؟ پھر محترم علمائے امت کی موجودگی میں اس سے الگ اس جماعت کی ضرورت ہی کیا ہے؟ پھر اگر اس وقت اس جماعت میں کچھ صاحبان علم وعمل افراد ہیں بھی تو ان میں ایسوں کا تو بالکل پتہ نہیں، جو بلا خوف لوم لائم اظہار حق میں بیباک ہوں،

صحابۂ کرام کی زندگیوں کے مرقع محفوظ ہیں، کیا اُن سے اس نظریہ کی تائید ہوتی ہے کہ مسلمانوں میں دو جماعتیں ہونی چاہئیے، ایک دین کی رہنمائی کے لئے اور دوسری دنیا کی، یا یوں کہا جائے، ایک مسلمانوں کے قلب وضمیر کی اصلاح کرے اور دوسری شریعت کے ظاہری احکام کی طرف رہنمائی کرے؟ اس کے علاوہ کوئی مسلمان اگر اپنی فطری صلاحیت سے اپنے اخلاق کی اصلاح کرنا چاہے تو کیا یہ ممکن نہیں ہے؟

یہ بھی ارشاد ہو جائے، کہ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی من مات ولیس فی عنقہ بیعۃ مات میتۃ الجاھلیۃ کا کیا مفہوم ہے؟ اور امام سے مراد امیر امت، قائد عسکر، مرشد طریقت وامام جماعت سب ہو سکتے ہیں، لیکن اول الذکر دونوں صورتوں میں ہندوستان کے کروڑوں حلقہ بگوشان اسلام کے لئے صورت تشفی کیا ہے؟

مشائخ کرام قرآن مجید کی سورۃ الفتح کی آیت ان الذین یبایعونک انما یبایعون اللہ الخ سے بھی استدلال فرماتے ہیں، اور بیعت طریقت کو لازمی گردانتے ہیں، کیا موجودہ مروجہ بیعتوں کو کوئی نسبت اس سے ہے، اور یہ بیعتیں کس حکم میں داخل ہیں؟ ایک بیعت اس خیال سے بھی کی جاتی ہے کہ تمام عمر جو کچھ بھی کرتے رہو، لیکن اگر کسی سلسلۂ عالیہ میں داخل ہوگئے تو بس تمام اگلے پچھلے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے، اب واقعی بیعت کی دو صورتیں رہ گئی ہیں، ایک کسی مسلمان کا اپنے گناہوں پر پشیمان ہونا اور کسی محترم شخصیت کے ہاتھ پر ترک گناہ کا عہد کرنا، مگر ظاہر ہے کہ آج کل یہ خیال سرے سے پیش نظر ہی نہیں، اب رہی دوسری صورت اور وہی یقیناً مبارک ہے، یعنی کسی مسلمان کو پورا پورا پابند شریعت اور متبع سنت پائے اور اس کے قدم بہ قدم چل کر اپنی دنیا و عاقبت سنوارے، لیکن جناب محترم مجھ سے کہیں زیادہ باخبر ہیں کہ آج مسلمان اس پر کہاں تک عامل ہیں۔ .. .. .. جامعہ عثمانیہ کے ایک ممتاز فاضل سے گفتگو آئی، اُن کی تقریر کا ماحصل یہ نکلا کہ مسلمان ان معاملات میں بھی دوسرے اقوام کے عقائد و خیالات سے متاثر ہوئے ہیں، اور انھوں نے تاریخی شہادتوں سے استناد کیا۔"

مراسلہ نویس کے دل میں جو خیالات اور سوالات پیدا ہوئے، بہتوں کے ذہن انہی الجھنوں میں پڑے ہوئے ہیں، اور سچ یہ ہے کہ جس سے وہ اپنی تشفی چاہتے ہیں وہ خود بھی کسی طبیب روحانی کا محتاج ہے، تاہم بعض پرانے مریض طبیبوں کی باتیں سنتے سنتے، ان کی دربارداری کرتے کرتے خود بھی نیم طبیب سے ہو جاتے ہیں، اور اگر خود بدستور بیمار ہی چلے آتے ہوں تاہم اپنے تجربوں سے نئے مریضوں کو

کچھ تو ڈھارس بندھا ہی سکتے ہیں،

سب سے پہلے ایک اہم اور بنیادی حقیقت کو پیش نظر کر لیجئے، صاف و صریح اتنی کہ اس کی وضاحت و صراحت بھی اکثر اس کی اہمیت کو نظروں سے گرائے اور دلوں سے بھلائے رکھتی ہے، اور وہ حقیقت یہ ہے کہ آج جو علاج ظاہری خالصتہً دینی کہے اور سمجھے جاتے ہیں، اور سب ہی اپنی موجودہ متعین و منضبط ہیئتوں اور صورتوں کے ساتھ مصطلحات کا انبار عظیم لئے ہوئے، بدعت کے لغوی مفہوم کے اعتبار سے بدعت ہی میں داخل ہیں۔

تفسیر، اصول تفسیر، فقہ، اصول فقہ و کلام کے آج جو ماشاء اللہ دفتر کے دفتر موجود ہیں، عہد رسالت میں یہ کہاں تھے، اور سب کو جانے دیجئے، براہ راست سنت رسول ہی کو لیجئے، آج حدیث کے متون ہی کا کتنا بڑا ذخیرہ موجود ہے، پھر ان کی شرحیں ہیں، ان کی تسہیل کے لئے مستقل لغات ہیں، دفاتر روایات و آثار کی کتنی مختلف قسمیں اور طبقات ہیں، سب کے الگ الگ مرتبے اور درجے ہیں رجال کا ایک مستقل فن ہے، احادیث کے جانچنے اور پرکھنے کے لئے روایت اور درایت کے قانون و ضابطے ہیں، مصطلحات فن کی تعداد سینکڑوں کی ہے، فن حدیث میں مہارت پیدا کرنے کے لئے برسوں کی محنت و مطالعہ اور مدتوں تک استادوں اور کاملین فن کی ہدایت اور صحبت لازمی ہے، ظاہر ہے کہ عہد رسالت میں یہ کچھ بھی نہ تھا، زبان عالمؑ کی سادہ اور معمولی روزمرہ کی گفتگو حدیث تھی اور آپ کا بڑا چھوٹا ہر عمل سنت ——

تو کیا اب کوئی اس بناء پر حضرات محدثین کی ساری کوششوں اور کاوشوں کو "بدعت" کہہ دینے کی جراءت کرے گا؟

اسی طرح حضرات فقہا کی ساری موشگافیاں، قیاس و اجماع کی بحثیں، استقراء و استنباط، تقلید و اجتہاد کے مسائل، عبارۃ النص اور اشارۃ النص، دلالۃ النص

اور اقتضاء النفس کی قسم کی سیکڑوں اصطلاحیں دور نبوی میں کہاں تھیں، اور کہاں سے ہو سکتی تھیں تو کیا کوئی بخاریؒ، مسلمؒ، ترمذیؒ، و ابو داؤدؒ کی طرح ابو حنیفہؒ و شافعیؒ، مالکؒ و احمدؒ، نخعیؒ و اوزاعیؒ، شیبانیؒ و طحاویؒ کی بھی جانفشانیوں کو ضائع قرار دینے اور "بدعت" کے حکم میں لانے کی جرأت کر کے، شریعت ہی کے بہت بڑے حصے سے انکار کر گذرے گا؟ ——— اور تو اور خود قرآن مجید اسی مکتوبی شکل میں اعراب و علامات وقف سے مزین، پاروں، سورتوں، رکوعوں اور آیتوں کے ساتھ مدون، عہد رسالت میں کہیں یکجا موجود تھا؟

بات بالکل صاف اور موٹی ہے، لیکن ذہن انسانی کا یہ بھی کچھ خاصہ سا ہے، کہ سامنے کی چیزوں کو اکثر ناقابل التفات سمجھے رہتا ہے، اور دور دراز کی باریکیوں میں الجھنے کا شوق رکھتا ہے، تو غرض یہ کہ جو حال فقہ کا ہے، حدیث کا ہے، تفسیر کا ہے، جملہ علوم ظاہری شرعی کا ہے، کچھ ویسا ہی حال علم باطن یعنی سلوک و تصوف کا ہے، عہد نبوی میں بے شک نہ لفظ تصوف رائج تھا نہ صوفی، اور نہ ذکر و شغل، حال و مکان، مکاشفہ و مراقبہ کی وہ سیکڑوں اصطلاحیں چلی ہوئی تھیں جن سے آج کتب فن لبریز ہیں، خود مرشد اور شیخ اور بیعت اور مسترشد بھی اس اصطلاحی معنی میں ناپید تھے، لیکن غرض یہ ہے کہ اس اصطلاحی معنی میں خود فن حدیث ہی کہاں موجود تھا، نہ کوئی اسماء الرجال کے نام سے آشنا تھا، نہ جرح و تعدیل کے اصول و قواعد سے، نہ ضعیف اور موضوع اور متواتر اور مشہور اور صحیح و حسن کی اصطلاحیں مقرر ہوئی تھیں، نہ کسی دماغ مدلس اور طبقات المدلسین کا مفہوم تھا، لیکن اگر نام و اصطلاح کی بحث سے گذر کر نفس حقیقت اور اصل مغز تک پہونچنا مقصود ہے، تو جس طرح ہر صحابی، یا بزم رسولؐ کا صحبت یافتہ اور دربار رسولؐ کا حاضر باش، اپنی اپنی جگہ اور اپنے درجہ ظرف اور بساط و استعداد کے موافق مفسر تھا، یعنی اپنے اپنے ظاہر

کے ساتھ اپنی باطن کی بھی اصطلاح کا طالب! ـــــ صحابہ کرام رضی مریدین و مرشدین تھے اور سب کے شیخ اور مرشد کل، وہی جو ساری دنیا کے لئے معلم و مزکی و مطہر ہو کر آئے تھے،

کہا جاتا ہے کہ تمسک بالکتاب والسنۃ کے بعد کسی رسمی شیخ کی ضرورت کیا باقی رہ جاتی ہے ـــ دہرا مغالطہ سوال کے اندر موجود ہے، ایک تو لفظ رسمی، خود تمسک بالکتاب والسنۃ بھی اگر محض رسمی ہی ہے، حقیقت سے خالی، تو کچھ زیادہ مفید نہیں، اصل ضرورت تو مردہ رسم میں حقیقت کی جان ڈالنے کی ہے اور پھر دوسری بات یہ کہ حقیقی تمسک بالکتاب والسنۃ بغیر کسی زندہ شخصیت کے توسط کے عموماً اور عادۃً ممکن (اور ممکن بھی ہو تو آسان) کب ہے؟

حدیث وسنت کے جن نوشتوں کو آج ہم سرچشمۂ تقدیس سمجھ رہے ہیں تو کیا تقدس انکے حروف ونقوش کاغذ کی سفیدی اور روشنائی کی سیاہی میں بکھر رکھا ہوا ہے انکے تقدس کی بنا بس اسی قدر تو ہے کہ انکے اندر دنیا کی زندہ ترین شخصیت کی روح کسی حد تک زندہ ہے یہ روح کیسی عجیب بات ہوگئی کہ بیجان کاغذ کے بیجان ورقوں میں تو منتقل ہو جائے اور انسان جسے اللہ نے روئے زمین پر اپنا خلیفہ مقرر کیا ہے، اس کے زندہ قالب وقلب میں منتقل نہ ہوسکے، یہ روح الماریوں کے سفینوں میں تو محفوظ رہ جائے، اور راست بازوں اور پاک سرشتوں کے سینوں کو مشتعل ومنور نہ کر دے تلک اذا قسمۃ ضیزیٰ،

شریعت ظاہر کا طالب علم کہتا ہے، کہ ہم کو فلاں اقوال واعمال کی تعلیم فلاں فلاں کتابوں کے ذریعہ سے رسول اکرمؐ سے حاصل ہوئی ہے۔ طریق باطن کا سالک سناتا ہے، کہ ہم کو فلاں احوال اور فلاں مقامات کی تحصیل فلاں اور فلاں شخصیتوں کے واسطہ سے رسول اکرمؐ سے پہونچی ہے! اب فرمائیے کہ دونوں کے درمیان اصلی اور اساسی فرق کیا ہوا؟

قرآن مجید رسولؐ کا تو کلام نہیں، اللہ کا کلام ہے، اور بندوں ہی کی ہدایت کے لئے نازل ہوا ہے۔ یہی ہم سب کا ایمان ہے، اور قرآن مجید اس دعوے کی بار بار صراحت کرتا ہے، کہ اس میں ساری ضروری ہدایتیں تفصیل کے ساتھ موجود ہیں، بایں ہمہ یہ نہ ہوا کہ قرآن لکھا لکھایا براہ راست تمام بندوں کے پاس پہنچ جاتا۔ منکرین اور مومنین اسے آسمان سے اترتا ہوا اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے۔ کسی اونچے پہاڑ کی چوٹی پر رکھا ہوا مل جاتا، یا ایک روز جب صبح ہوتی تو اس کا ایک ایک نسخہ ہر شخص کے سرہانے موجود ہوتا۔ قادر مطلق کے لئے ان میں سے کوئی شے دشوار تھی؟ لیکن حکیم برحق نے یہ کچھ نہ کیا، بلکہ اس کے برعکس یہ طریقہ اختیار کیا کہ پہلے ایک تباہ کار قوم کے درمیان، جو جغرافی اعتبار سے اُس وقت کی آباد و مہذب دنیا کے عین مرکز میں آباد تھی، ایک پاکیزہ سرشت و صالح مزاج انسان پیدا کیا، ۴۰ سال کی عمر تک اُس شخصیت کو اس قوم کے درمیان ہر قسم کے سابقہ اور تعلق کے ساتھ چلتا پھرتا ہوا رکھا اور اس کی سرشت و سیرت، عادات و اطوار کی جزئیات تک کی جانچ اور پرکھ کا موقع اس کی قوم والوں کو دیا۔ جب یہ سب مرحلے طے ہو چکے، جب جا کر پیام کا نزول شروع ہوا۔ پھر اُس وقت بھی 'پیام' سے پیشتر 'پیامبر' ہی کی شخصیت کو پیش کیا گیا، اور جب قوم اس شخصیت کے صادق اور امین ہونے کا اقرار کر چکی، جب اُس سچے کی زبان سے سچے کلام کی ادائی شروع کی گئی۔ اس پر بھی سارے پیام کو دفعۃً پیش نہیں کر دیا گیا، بلکہ پیامبر کی شخصیت پر مختلف دور اور طور طاری کر کے ۲۲-۲۳ سال کی مدت میں بہت ہی تدریج کے ساتھ اس پیام کو انجام تک پہونچایا گیا۔ پس فطری و ربانی ترتیب تو یہ ٹھہری کہ پہلے پیامبر پھر پیام۔ پہلے طبیب پھر نسخہ، پہلے ہادی پھر ہدایت، اب اگر ہم اس ترتیب کو الٹ دینا چاہیں، اور ہادی سے قطع نظر کر کے ہدایت تک، اور اشخاص سے بے نیاز ہو کر

مسائل تک پہونچ جانا چاہیں، تو یہ فطری اور ربانی ترتیب سے موافقت نہ ہوئی۔

اور یہ خیال نہ گذرے کہ یہ طریق دعوت و اسلوب ہدایت کچھ وحی الٰہی اور ذات پیغمبر کے ساتھ مخصوص رہا ہے، نہیں بلکہ خود رسول نے اپنے قصد و ارادہ سے تبلیغ دین کا جو طریقہ اختیار کیا وہ بھی کچھ اسی طرح کا تھا، آپ نے یہ نہ کیا کہ قرآن مجید کے کامل نسخوں سے اس کے اجزاء کی نقلیں کرا کے اپنے ملک کے اطراف و جوانب میں بھیج دیتے، یا اپنے اقوال و سنن کو ضبط تحریر میں لا کر ملک میں ان نسخوں کی اشاعت کر دیتے، بلکہ آپ نے ایک بہت بڑی جماعت اپنے صحابیوں، رفیقوں، شاگردوں مریدوں ہی کی پیدا کی، **اشخاص** ہی تیار کئے، جو اپنی زندگیوں کے لحاظ سے آپ کی تعلیم اور آپ کے عمل دونوں کے جیتے جاگتے نمونے، چلتے پھرتے نسخے، بولتے چالتے مرقعے تھے، اور دین کی روشنی آپ نے انھیں زندہ مشعلوں کے ذریعے سے پھیلائی۔ آپ نے یہ نہ کیا کہ کسی گوشہ میں خلوت نشیں ہو کر، سکوت و عافیت کی فضا میں، قلم اور دوات لے کر بیٹھ جاتے، اطمینان سے تصنیف میں مشغول ہو جاتے، اور توحید و رسالت و معاد کے عقائد پر مقالے اور معاملات و عبادات پر رسالے تیار فرمانے لگتے بلکہ آپ نے نور ہدایت سے براہ راست قلوب و نفوس کو منور کرنا شروع کر دیا۔ آپ کی یادگار، آپ کی کوئی کاغذی تصانیف نہیں ہیں، بلکہ وہ انسانی تصانیف ہیں، گوشت و پوست کے بنے ہوئے جسم اور تقویٰ و طہارت میں ڈھلی ہوئی روحیں ہیں، ان زندہ تصانیف کی تعداد ہزارہا تک پہونچی اور ان میں سے مشہور ترین کے نام ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ و علیؓ ہیں۔ پھر یہ حضرات بھی اپنے اپنے عہد اور دور میں کتابی تصنیف و تالیف پر ذرا بھی متوجہ نہ ہوئے، حالانکہ اس وقت عجم و روم کے علوم و فنون و صنائع مسلمانوں کے علم میں آ چکے تھے، بلکہ یہ بھی برابر اسی میں لگے رہے، کہ زندہ ہستیوں کو اپنے نمونہ پر

ڈھالتے رہیں، اور اپنے شاگردوں کے جسموں میں اپنی روحوں کا نفخ دم کرتے رہیں، اور اپنے چراغ سے دوسرے چراغ بھی روشن کرتے رہیں'۔۔۔۔ یہ جو اتنے فضائل و کمالات آپ صحابہؓ کے، اہلِ بیتؓ کے، مہاجرینؓ کے، انصارؓ کے، تابعین کے، تبع تابعین کے، سنتے چلے آرہے ہیں، تو خود ان الفاظ ہی پر غور کیجئے، کہ یہ کون لوگ ہیں؟ وہی صحبت اور رفاقت کے رکھنے والے، بیعت کرنے والے ارادت رکھنے والے، شاگرد و مریدین ہی ہیں یا کوئی اور؟

مادّی علوم و فنون میں آج کون سا علم و فن یا دستکاریوں میں سے آج کون سی صنعت ایسی ہے، جس میں استاد کی مدد ناگزیر نہیں، شاعری، ادب، طب، قانون، ریاضی، انجینیری، آخر کون سا شعبۂ زندگی؟ درآنحالیکہ ہر علم و فن اور ہر صنعت پر بیشمار کتابیں چھوٹی اور بڑی، مبتدی و منتہی دونوں کے کام کی موجود ہیں۔ تو پھر آپ کی عقل یہ کیسے قبول کرلیتی ہے، کہ روحانیت کا علم جو ان سب علوم سے لطیف تر ہے، وہ بے استاد رہ جانے سے کوئی نقص پیدا نہ کرے گا؟ اور تزکیہ نفس کا فن جو سارے فنون سے دقیق تر ہے محض کتابوں کی مدد سے پورا آجائیگا؟ اللہ کی معرفت جو ہر معرفت سے نازک تر ہے، بغیر کسی رہبر و معلّم کے از خود پوری طرح حاصل ہو جائے گی؟۔۔۔۔ استاد اور رہنما تو اس سفر میں قدم قدم پر ناگزیر ہے، اور اسی استاد یا رہنما کا اصطلاحی نام شیخ یا مرشد ہے،

کہا گیا ہے کہ علماءِ حق کے ہوتے ہوئے پیروں اور مشائخ کی ضرورت کیا ہے، لیکن عرض یہ ہے کہ یہ "علماءِ حق" اور "مرشدین" و "شیوخ" کی درمیانی تفریق تو ہماری آپ کی قائم کی ہوئی، حقیقۃً اور اصلاً ہے کب؟ قرآن تو صالحین، صادقین، متقین، مومنین، موقنین، خاشعین، محسنین، ذاکرین، مخبتین، قانتین، عابدین، صابرین، شاکرین، مخلصین کی جماعت پیدا کرنا چاہتا ہے، اور وہ ہستیاں علم و عمل

کی، حال و قال کی، قلب و قالب کی، ظاہر و باطن کی، فقر و درویشی کی جامع ہوتی تھیں۔ اس میں ہماری خود ساختہ تفریق "علم" و مشیخت کی گنجایش ہی کہاں ہے؟ یہ تفریق تو دوسری بہت سی تفریقوں کے دور انحطاط نے پیدا کر رکھی ہے، اور وہی اس کا ذمہ دار ہے۔ —— تذکرۃ الاولیا اس سے ملتی جلتی ناموں کی جتنی بھی پرانی کتابیں ملتی ہیں، انھیں اٹھا کر دیکھ لیجئے، سری سقطی اور جنید بغدادی، معروف کرخی، اور بایزید بسطامی، ذوالنون مصری، اور فضیل بن عیاض سے قبل نام ابو حنیفہ و شافعی مالک و احمد کے اور ان سے بھی قبل نام خلفائے راشدین کے نظر آئیں گے۔

طریق کی اہم حقیقت شیخ یا مرشد کی صحبت ہے، لفظ "صحابی" ہی زہد و طاعت تقویٰ و عبادت و علم و فضل غرض کسی اور وصف کو نہیں، "صحبت" ہی کی اہمیت کو واضح کر رہا ہے، اور مرشد بھی وہی ہوتا ہے جس کا نفس خود ہی تزکیہ حاصل کئے نہیں ہوتا، بلکہ اپنی صحبت و رفاقت سے دوسروں پر بھی اثر تزکیہ ڈال سکتا ہے اور جو اپنے کمالات کو دوسروں تک متعدی کر سکتا ہے، شیخ وہ مصلح ہوتا ہے، جو یہ صلاحیت رکھتا ہے، کہ اپنی ہم نشینی سے دوسروں کی فطری صلاحیت کو ابھار سکے، پس مرید ہونے یا بیعت میں داخل ہونے کے معنی اس سے زائد اور کچھ نہیں، کہ جس کے صالح و صادق ہونے پر بھروسہ ہو، اور جس کی شان طاعت و تقویٰ سے اپنا ضمیر و وجدان مطمئن ہو، اس کے اتباع کا قصد و اہتمام کیا جائے، اور طاعت و نیازمندی کے ساتھ اس کی خدمت میں حاضری دی جائے، بیعت اور مریدی اس معنی میں بدعت ہونا کیا معنی ہیں، عین حکم الٰہی وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ کی تعمیل ہے، پوری آیت ملاحظہ ہو،

(۱) یَا اَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا (۲) اتَّقُوا اللّٰهَ (۳) وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ

گویا محض ایمان کافی نہیں، ایمان والوں ہی سے تو خطاب ہے، ایمان تو وہ لا ہی چکے ہیں، اب ان سے کچھ اور مطالبہ بھی ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہو کہ "اے ایمان والو! اللہ سے تقوی اختیار کرو" ادائے حقوق، اجتناب معصیت وغیرہ سب اس حکم تقوی کے تحت میں آگئے، لیکن اتنا ہی کافی نہیں، مزید حکم ملتا ہے کہ "صادقوں کی معیت اختیار کرو، راست بازوں کی صحبت و رفاقت میں رہو"

اور یہی عین مریدی ہے،

مشکل یہ ہے کہ ادھر نام تصوف کا لیا گیا، اور ادھر ذہن کے سامنے آج کل کے مشائخ اور شاہ صاحبوں اور سجادہ نشین پیرزادوں کی اور انکی محفلوں کی تصویریں سامنے آجاتی ہیں غالی عقیدت مند چاروں طرف سے حلقے میں لئے ہوئے ہیں، درمیان میں شاہ صاحب گیروے کپڑوں یا صندلی لباس میں تشریف فرما ہیں، کوئی کام ہے نہ کاج، نہ دینی تذکرے، نہ پند اور مواعظ، نہ نماز نہ قرآن، نہ ادائے حقوق عباد اور جائز کسب معاش کی کوئی فکر و اہتمام، پان پر پان چبائے جا رہے ہیں پیالے کا دور چل رہا ہے، اور یا پھر اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ قوالی کی محفل گرم ہے، ستار اور ہارمونیم کے پورے لوازم کے ساتھ گانا، امردوں کا بلکہ نامحرموں کا سنا جا رہا ہے نا ستقوں کا مجمع ہے، عرس کی تاریخیں آگئی ہیں، قبروں پر چادریں چڑھ رہی ہیں، منتیں مانی، اور مرادیں مانگی جا رہی ہیں، مٹھائیوں کے دونے اور حلوے، توشے کے خوان پیش ہو رہے ہیں، نذر و نیاز، چڑھاوے کے نام سے روپیہ پیسہ کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں، گفتگو میں سارے منہیات شرعی کا ارتکاب بے تکلف ہو رہا ہے، نہ غیبت سے بچنے کی فکر، نہ دلآزاری سے محتاط رہنے کا اہتمام تو غرض یہ کہ سائل کے پیش نظر عموماً اس طرح کے منظر ہوتے ہیں اور پھر شہمات و سوالات پیش کئے جاتے ہیں، نفس تصوف و سلوک کے

بیعت سے متعلق! ——— گویا چورا ہے کے اشتہاری دوافروش یا محلہ کے اناڑی نیم حکیم خطرۂ جان" پر قیاس حکیم اجمل خاں اور حکیم محمود خاں دہلوی کے مطب کا کیا جارہا ہے! ——— جو چیزیں سلوک و طریقت سے الگ ہی نہیں بلکہ ان کی عین ضد ہوں انھیں دیکھ کر نفس طریق کی طرف سے مشکوک یا بدگمان ہو جانا، یہ تو سائل کا ظلم خود اپنی بصیرت پر ہوا[1]۔

سوال میں ذکر اتباع رسول کا کیا گیا ہے، لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے، کہ سوال کے پس منظر میں اتباع صرف افعال خارجی اور اعمال ظاہری کا رہا، حالانکہ پیکر خاک کے اندر ایک نور پاک بھی جلوہ گر تھا، اور اس نور کی تجلی ریزی ہر لمحہ اور ہر گھڑی ہوتی رہتی تھی تمام صحابہؓ ہر حیثیت سے مساوی نہ تھے، اپنا اپنا ظرف تھا، خالد جاں باز میدان تھا

---

[1] آپ بیتی کا بھی ایک ٹکڑا اسی سلسلہ میں سنتے چلیے۔ ۱۹۲۲ء کا ذکر ہے، لکھنؤ (محلہ امین آباد) میں ایک اچھے نامور مسلمان ڈاکٹر صاحب تھے، جنھیں مذہبی بحث مباحثوں کے سننے میں خاص لطف آیا کرتا تھا، ایک روز جو میں حاضر ہوا تو ایک اجنبی صاحب بیٹھے ہوئے ہیں، ڈاکٹر صاحب مجھے دیکھ کھل گئے، اور بولے آپ خوب موقع سے آگئے، ذرا ان صاحب سے بحث کیجیے، یہ تصوف کے شدید منکر ہیں، وہ صاحب بھی جیسے مناظرہ کے لئے تنے بیٹھے تھے، جھٹ میری طرف متوجہ ہو گئے، میں نے عرض کیا، گفتگو سے قبل موضوع کا صاف ہو جانا ضروری ہے، عرض یہ ہے کہ تصوف کس تصوف پر ہوگی، آیا بدعو شاہ، نتھو شاہ، خیر شاد کے ہو حق پر یا اس طریق پر جو حضرت جیلانیؒ اور شیخ سہروردیؒ وغیرہ اکابر فن کی کتابوں میں مدون ملتا ہے، اگر پہلے پر ہے تو میں پہلے ہی سے اپنی ہار مانے لیتا ہوں، باقی اگر فتوح الغیب یا عوارف یا کتاب اللمع یا قشیریہ پر آپ کو کچھ فرمانا ہے تو بسم اللہ میں سنوں گا، کہ ان کے کون کون سے مقامات آپ کو کتاب اللہ یا سنت رسول کے مخالف نظر آتے ہیں۔ بس اتنے پر وہ صاحب تو کچھ کھوے گئے، اور ڈاکٹر صاحب بیچارے اپنا دل پسند تماشہ دیکھنے سے محروم رہ گئے۔

کے یکجا تاز ہوئے، ابوہریرہؓ روایات حدیث کی اشاعت میں لگے رہے، ابن عباسؓ کی قسمت میں ترجمان القرآن بننے کی سعادت آئی، ابن عمرؓ نے ترویج سنت کی خوش نصیبی پائی، ابوبکر صدیقؓ نے زمام خلافت کو سنبھالا، غرض ہر ایک کا مذاق طبیعت جداگانہ تھا، اور استعداد و صلاحیت الگ الگ۔ اکثریت کی توجہ قدرۃً امور خارجی پر زیادہ رہی، رسول نے نماز میں ہاتھ سینہ پر باندھے یا ناف پر؟ آمین سورۂ فاتحہ کے ختم پر آواز سے کہی یا آہستہ؟ اس قسم کے مسائل کا مطالعہ بڑی تفصیل و وسعت سے ہوتا رہا، لیکن ایک دوسری جماعت کی نظر قال سے زیادہ حال پر، ظاہر سے زیادہ باطن پر رہی، انھوں نے محض غزوۂ بدر اور فتح مکہ کا جاہ و جلال ہی نہیں دیکھا، بلکہ غار حرا کی خلوت آرائیوں کا بھی مزہ چکھا، انھوں نے محض حرض المومنین علی القتال ہی کا پیام نہیں سنا، بلکہ سبحان الذی اسری بعبدہٖ کی حقیقت کو بھی پہچانا، ان کی نگاہیں انہیں تک محدود نہیں رہتیں کہ نماز میں رکعتیں کتنی اور کس قاعدہ سے پڑھی گئیں بلکہ یہاں تک بھی پہونچیں کہ نماز کس ذوق شوق سے پڑھی گئی، خضوع و خشوع کی کیا کیفیتیں طاری رہیں، اور زبان کے ساتھ دل کن کن منزلوں سے گزرتا رہا۔ اس نعمت کے حصہ دار کم و بیش تو سب ہی صحابی تھے، لیکن جو خصوصیت کے ساتھ اس دولت سے مالا مال رہے، اور آج بھی ہر شجرۂ طریقت کے سر سلسلہ ہیں ـــــ حضرت ابوبکرؓ و حضرت علیؓ مرتضیٰ، حضرت ابوعبیدہؓ، حضرت سلمانؓ وغیرہم بلکہ بعض قدیم کتب سلسلہ میں تو صراحت کے ساتھ نام حضرت عمرؓ اور حضرت عثمان کے بھی درج ملتے ہیں۔

شریعت، اور طریقت کے درمیان رشتۂ تضاد و نسبت تنافی جو ہمارے دلوں میں خدا معلوم کب سے اور کہاں سے جاگزیں ہو گئی ہے، یہ تو تمامتر ہماری ہی پیدا کی ہوئی ہے ورنہ اکابر طریقت تو اس سے صاف لفظوں میں تبری کر رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ شریعت کے نقطۂ کمال ہی کا نام طریقت ہے، اتباع رسول جبتک ظاہر و خارج، اعضاء و

جوارح تک محدود ہے، اس کا نام شریعت ہے، اور جب قلب و باطن بھی اسی نورانیت سے منور ہوگیا، تو یہی طریقت ہے۔ ایک شخص نے نماز ظاہری ضابطوں اور قاعدوں کے مطابق پڑھ لی تو اس کی نماز شریعت کی نظر میں ہوگئی۔ فقیہ اسے کافی سمجھے گا لیکن اہل طریق اس پر مطمئن نہ ہوں گے، ان کا اس پر اصرار ہوگا، کہ جس طرح چہرہ خانۂ کعبہ کی طرف رہا، قلب رب کعبہ کی جانب متوجہ رہے اور جس طرح جسم و لباس ظاہری نجاستوں سے پاک رہا، دل و دماغ بھی اندرونی تاریکیوں، آلائشوں، پراگندہ خیالیوں سے پاک صاف رہے۔ — یہ شریعت کی مخالفت ہوئی یا عین منشائے شریعت کی تکمیل؟

اکبرالہ آبادی جس پایہ کے شاعر ہوئے ہیں، اسی درجہ کے حکیم و عارف بھی تھے، ایک طویل نظم انھیں مقامات شریعت و منازل طریقت کی شرح و توضیح میں کہی ہے دو چار شعر ملاحظہ ہوں،

شریعت در محفل مصطفےٰ ۔۔۔ طریقت عروج دلِ مصطفےٰ
عبادت سے عزت شریعت میں ہو ۔۔۔ محبت کی لذت طریقت میں ہے،
شریعت میں ہے صورت فتح بدر ۔۔۔ طریقت میں ہے معنیٔ شق صدر
نبوت کے اندر رہی ہیں دو نوں رنگ ۔۔۔ عبث ہے یہ ملا و صوفی کی جنگ

انھیں کی ایک دوسری نظم کے دو شعر ؂

ملا پکارتے ہیں منطق کی جنگ اچھی ۔۔۔ صوفی کا ہے ترانہ حق کی ترنگ اچھی
ملا یہ کہہ رہے ہیں قرآن ہی سے پڑھئے ۔۔۔ صوفی یہ کہہ رہے ہیں معنی سمجھ کے پڑھئے

اور ایک اور مصرعہ

شریعت ہے تم پر طریقت ہے تم میں

آخر یہ ارشاد بھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا ایک باخبر سائل کے

جواب میں ہے کہ

قال ما الاحسان قال ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک ،

(بخاری کتاب الایمان)

احسان اس کا نام ہے کہ اللہ کی عبادت اس طرح کی جائے جیسے تو اسے دیکھ رہا ہے اور اگر تو اسے نہیں دیکھ سکتا تو وہ تو تجھے دیکھ رہا ہے،

پوری حدیث ذرا طویل ہے، اس میں ایمان کی تشریح بعض عقائد سے کی گئی ہے، اور اسلام کی توضیح بعض اعمال سے، اس کے بعد تیسری توضیح احسان کی ہے، گویا عقیدہ و عمل دونوں کے بعد ایک تیسری منزل ان سے بلند تر احسان کی آتی ہے، جس کا تعلق صرف جاننے اور ماننے اور کرنے اور برتنے سے نہیں بلکہ مشاہدہ و رویت سے بھی ہے، اور یہی منزل سلوک و طریقت کی ہے، مشہور عارف و فاضل شاہ ولی اللہ دہلوی نے بھی اہل تصوف کے بجائے "اہل احسان" ہی کی اصطلاح آیۂ قرآنی والذین اتبعوھم باحسان سے اخذ کر کے اختیار کی ہے اور بعض اہل علم نے اہل صدق اور صدیقین کی اصطلاحوں کو چلانا چاہا ہے لیکن خیر یہ ساری بحثیں لفظ و اصطلاح کی ہیں، اصل سوال صرف یہ ہے کہ ایمان کے اجزاء اور اسلام کے ارکان تو کتابوں سے بیشک دریافت ہو جاتے ہیں، لیکن ہر عمل کے پیچھے جو روح عمل کارفرما ہوتی ہے، وہ محض ان کتابی واسطوں، اور نوشتوں سے پوری طرح حاصل کر لی جائے؟ قلب کو مرتبۂ احسان تک پہنچانا' باطن کا تزکیہ، نفس کا جلا، اخلاق کی پاکیزگی، عادت و خصلت میں ایثار' یہ سب بغیر ایک زندہ معلم کی وساطت کے عموماً و عادۃً کیونکر ممکن ہے؟ جو قانون اور ضابطے کتابوں میں درج کرنے والے تھے، وہ بیشک بڑی تحقیق اور پوری

تفصیل کے ساتھ حدیث و آثار و فقہ کی کتابوں میں مدون ہوتے رہے، لیکن جو چیزیں ایک قلب سے براہ راست دوسرے قلب میں منتقل ہونے کی ہیں، ان کے لئے کاغذ کے طومار اور روشنائی کے ڈھیر کس حد تک کافی ہو سکتے ہیں؟ ہر عمل ظاہر ہے کہ اپنی ایک صورت بھی رکھتا ہے، اور ایک روح بھی، فقہ کا تعلق صورت عمل سے ہے، اور سلوک و طریقت کا روح عمل سے۔

پھر یہ بھی خوب لحاظ رہے، کہ جسے شیخ یا مرشد کہا جاتا ہے، وہ کوئی خود رائے اور خود رو ہستی نہیں ہوتی، قرآن مجید کی محفوظیت کے قائل ہم آپ اس کی سند متصل ہی کی بناء پر تو ہیں اور بخاریؒ کی بھی کوئی روایت، اسی لئے تو حدیث رسول تسلیم کی جاتی ہے، کہ وہ معتبر سند مسلسل کے ساتھ چلی آتی ہے، بس کچھ اسی طرح، گو یقیناً اسناد قرآن تو کجا، اسناد حدیث سے بھی کہیں ہلکے پیمانہ پر، پیر و مرشد کا قلب، بھی واسطہ در واسطہ، سلسلہ بہ سلسلہ، مرشد کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک سے ملا ہوتا ہے، اس کا رابطہ روحانی بھی، ایسی کچھ ہی زنجیر کی کڑیوں کی طرح سرچشمۂ تقدیس و روحانیت سے جڑا ہوتا ہے؟ ایک گروہ بخاریؒ، مسلمؒ و ابو حنیفہؒ و شافعیؒ کی قیادت میں اگر اخبار رسولؐ آثار رسولؐ کو اپنے ضخیم دفتروں میں مدون کرتا رہا، تو دوسری طرف کچھ لوگ حسن بصریؒ اور ابو طالب مکیؒ کی امامت میں اسرار رسولؐ اور انوار رسولؐ سے اپنے قلب و سینہ کو گلزار کرتے رہے، ادھر رسولؐ کا قال ایک سفینہ سے دوسرے سفینہ میں نقل ہوتا رہا، ادھر رسولؐ کا حال ایک سینہ سے دوسرے سینہ کو طور سینا بناتا رہا۔

دونوں شعبوں کی جامعیت اور کاملیت قرون اولیٰ میں بھی ہر خوش نصیب کے حصہ میں یکساں نہیں آئی تھی، پھر آج اس کے نمونے کثرت سے کیونکر نظر آنے لگے تاہم کوئی زمانہ ایسی ہستیوں سے بالکل خالی بھی نہیں رہتا، حکیم الامت مولانا

اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کو دیکھنے والی آنکھیں تو ابھی ہزارہا کی تعداد میں موجود ہیں، کاملین کسی فن کے کسی زمانہ میں بھی کثرت سے نہیں ہوتے، پھر جو فن سب فنوں سے لطیف تر و شریف تر ہو، اُس کے ماہرین و کاملین ظاہر ہے کہ انگلیوں ہی پر شمار کرنے کے قابل ہوں گے، لیکن یہ بھی ظاہر ہے، کہ یہاں بحث کثرت و قلت سے نہیں، نفس وجود سے ہے۔

سوال کیا گیا ہے، کہ کوئی مسلمان اگر اپنی فطری صلاحیت سے اپنے اخلاق کی اصلاح کرلینا چاہے، تو کیا ایسا ممکن نہیں، ممکن بے شک ہے، لازمی اور ناگزیر تو صرف تصدیق نبوت ہے، ایک نبی تو بے شک ایسا ہوتا ہے کہ اس پر ایمان لائے بغیر محض اپنی طبیعت یا خالص عقل و استدلال کی مدد سے کسی انسان کا صالح و مقرب بن جانا ممکن نہیں، باقی اس کے سوا کسی بڑے سے بڑے صالح یا مصلح یا نائب نبی کا اتباع بلکہ تصدیق بھی ناگزیر ہرگز نہیں، یہ مرتبہ تو صرف نبی کے لئے مخصوص ہے لیکن دوسری طرف عام فطرت بشری ہے ایسی کہ بغیر کسی صالح و مصلح شخصیت کی رہنمائی و توسط کے تزکیۂ اخلاق کافی حد تک ہوجانا، عموماً اور عادۃً آسان نہیں، کمتر ہی لوگ ایسے ہوتے ہیں، جو محض اپنی عقل سلیم اور کتابوں کی مدد سے صالحیت کے مرتبہ پر پہونچ جائیں، ورنہ اکثر و بیشتر تو ضرورت ایک رہنما، استاد، معلّم یا ہادی کی رہتی ہی ہے، بلکہ بعض طبیعتیں تو ایسی ہوتی ہیں، جن میں انقیاد و اطاعت کا مادہ خلقۃً کم ہوتا ہے، اور تنقید و نکتہ چینی کا زیادہ، ایسوں کے لئے تو کسی شیخ کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دینا بجائے مفید کے مضر ہی پڑے گا، شیخ بھی بہرحال بشر ہی ہوتا ہے، ایسے اشخاص کی نظر اُس کی بشری کمزوریوں ہی پر زیادہ پڑے گی، اور اس سے بجائے نفع کے الٹے نقصان ہی کا اندیشہ ہے، غرض کسی شیخ کے اختیار کرنے پر یہ جو زور دیا گیا ہے، اُس کی حیثیت کلیہ کی نہیں، لیکن اکثریہ کی ہے،

لیکن اس تجربی اور عملی شہادت سے قطع نظر جس اقتدار رسول و اتباع رسول پر حدیث کیا معنی نصِ قرآنی تک ناطق ہے، اُس حکم اقتداء و اتباع کو صرف احکام ظاہر تک محدود رکھنے کی آخر کیا دلیل ہے؟ کوئی بھی نہیں۔ حکم اطاعت رسول جہاں کہیں کہیں وارد ہوا ہے، مطلق و غیر مُعیّن صورت میں آیا ہے، ظاہر و باطن کی اس میں کوئی تخصیص نہیں، دونوں کے مجموعہ پر شامل ہے، نماز کے اوقات، رکعات کی تعداد، رکوع و سجود کی ہیئت، قرأت و قیام و تشہد کی نوعیت ہی نہیں، بلکہ نماز کے اندر خضوع و خشوع، حضور رب میں ذوق و شوق وغیرہ بھی تو اس اسوۂ حسنہ ہی کے حکم میں داخل ہیں، گو ظاہر ہے کہ ان لطائف و دقائق کا ادراک بھی چونکہ جلی نہیں، اس لئے ان کا تحقق بھی نسبۃً خفی ہی ہوگا۔ تو غرض یہ کہ اس پیروئ باطن رسول کی کیا صورت بجز اُس شخصیت کی پیروی کے ہے، جسے رسول سے سلسلہ بہ سلسلہ یہ نعمت مل چکی ہو، رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے اصل مقصد بھی تو کلام مجید میں "تلاوت آیات الٰہی کے بعد ایک نہیں دو بتائے گئے ہیں،

رسولا منھم یتلوا علیھم آیاتہ — ایک تزکیۂ نفس و تقوائے قلوب

و یزکیھم و یعلمھم الکتاب والحکمۃ — دوسرے تعلیم و تشریح کتاب و حکمت

کتاب و حکمت کی تعلیم و تشریح کا سامان تو الحمد للہ محدثین و فقہاء کی تربیتوں کو ٹھنڈا رکھے، ان کی جانفشانیوں سے ہوگیا، لیکن حکم تزکیۂ نفوس کی تعمیل کی عملی صورت آخر کیا ہو؟ یا خدانخواستہ کچھ یہ صورت ہے کہ امت نے اس حکم کو قابل تعمیل ہی نہ سمجھا؟ نہیں اور ہرگز نہیں، "مرشد کی تلاش" یعنی ایک زندہ و مکمل نائب رسول سے تعلق اتباع، اس سوال کا جواب ہے، مرشد کے لفظ سے ذہن ہرگز چادر، ناد، گاگر، مزار اور صندل، ستار اور طنبورہ کی طرف منتقل نہ ہو، مراد اس سے صرف ایک زندہ روحانیت ہے،

یہ مرشد صحیح معنے میں مقلد محض ہوتا ہے، استاد ازل کے سبق کو دہرا دینے والا، آئینہ کے عقب میں طوطی ـــ ایجاد و اختراع ہرگز اس کا منصب نہیں ـــ لیکن اجتہاد جزوی اور استنباط کا دروازہ تو مقلدوں کے ماہرین فقہ اور غیر مقلدوں کے ماہرین حدیث دونوں کے لئے کھلا ہوا ہے پھر اس رحمت عالم کا دروازہ غریب صوفی ہی کے حق میں کیوں بند رہے؟ وہ اپنے تجربات و مشاہدات کی طرف سے آنکھیں بند نہ رکھے گا، جس طرح اہل ظاہر اپنے حواس و عقل کو معطل نہیں کر دیتے، وہ نور نبوت ہی کی روشنی میں تدبیریں اور معالجے وقت اور ماحول کی مناسبت سے مرض کی نوعیت اور مریض کے مزاج کے مطابق نکالتا اور بتاتا رہے گا، یہ اس کی خود رائی نہ ہوگی، عین اجرائے حکم نبی ہوگا، یہ بدعت کی نہیں اتباع سنت ہی کی صورت ہوگی، البتہ اس کے لئے بھی حدود و قیود ضرور ہیں، جس طرح کہ اہل ظاہر کے لئے احکام کے اجتہاد و استنباط کے لئے قاعدے ہیں، پابندیاں ہیں، یہ نہیں کہ اندھا دھند وہ جس چیز کا چاہے، حکم دیدے، جس عمل کو چاہے ممنوع ٹھہرا دے۔

مصیبت یہ ہے کہ دلیل کے مقدمات میں مثالیں، بہروپیوں کی، اناڑیوں کی پیش نظر رہتی ہیں، اور نتائج نکالتے وقت سرے سے اصلیت و واقعیت ہی سے انکار کر دیا جاتا ہے، یہ کہاں کا انصاف اور تقاضائے دیانت ہے، کہ اگر آپ کئی بار پیتل پر سونے کا دھوکا کھا چکے ہیں، تو آپ سونے کے وجود ہی سے منکر ہو جائیں، اگر چوراہے کے اشتہاری دوا فروش آپ کو ٹھگ چکے ہیں، تو آپ اطبا و حاذقین کے بھی دشمن ہو جائیں ـــ کہا جاتا ہے کہ "بیعت کا مقصد اگر دعوت الی الحق ہے تو مشائخ کی جماعت اس فرض کو کہاں تک ادا کر رہی ہے" یہ سوال معقول ہے لیکن تلاش ہیں کیوں ختم کر دی جاتی ہے، علماء ظاہر کا بڑا گروہ آج کب فریضہ امر بالمعروف ادا کر رہا ہے، اور یہ امت کہاں تک اسلام کے بتائے ہوئے

چل رہے ہیں، تاجروں کو کتنا خیال دیانت واکل حلال کا باقی رہ گیا ہے، وقس علیٰ ہٰذا
ظاہر ہے کہ امت کا کوئی سا طبقہ بھی آج اگر اپنے فرائض پر چٹان کی طرح قائم ہوتا، تو
امت کو یہ دن دیکھنا ہی کیوں نصیب ہوتا، اچھے برے، نیک و بد، کھرے کھوٹے،
امت کے ہر طبقہ کے اندر ہیں، بدوں کی اکثریت سے گھبرا کر نیکوں کی اقلیت کے
وجود سے انکار کر بیٹھنا، قرین عقل ہے، نہ تقاضائے شریعت،

نفی حکمت مکن از بہر دل عامے چند

تصوف وسلوک کے نام کو بدنام کرنے والوں کے ہجوم عام میں اُسے نیک نام رکھنے
والے کچھ حقیقی صوفی تو ہمیشہ کی طرح آج بھی موجود ہیں،

شاہ ولی اللہ دہلویؒ جو اپنے زمانے میں اس فن کے امام ہوئے ہیں، اپنے
رسالہ القول الجمیل میں تحریر فرماتے ہیں کہ بیعت سنت رسول ہے، اور بیعت کا اطلاق
صرف بیعت خلافت تک محدود نہیں بلکہ عہد نبوت میں بیعت کی مختلف صورتیں
تھیں، مثلاً بیعت خلافت، بیعت جہاد، بیعت توبہ وغیرہ —— صوفیہ کی مروجہ بیعت،
بیعت تقویٰ میں داخل ہے، خلفائے راشدین کے زمانہ میں اس بیعت کی علیحدہ ضرورت
نہ تھی، اس لئے کہ ان سے جو بیعت خلافت ہوتی تھی اس میں یہ بیعت بھی داخل و شامل
ہوتی تھی، اس کے بعد ایک عرصہ تک یہ بیعت، بیعت خلافت کے ساتھ التباس و
اشتباہ کے اندیشہ سے ملتوی و موقوف رہی، اور وہ صوفیہ اس بیعت کا قائم
مقام خرقہ کو سمجھتا رہا، پھر جب ملوک وسلاطین کا دور دورہ پوری طرح ہو گیا، اور
خلافت رسول کی بیعت بند سی ہو گئی، تو صوفیہ کرام نے بیعت تقویٰ کی سنت مردہ کو
پھر سے زندہ کیا، —— آگے چل کر جہاں بیعت لینے والے مرشد کے
اوصاف وخصائص شمار کرتے ہیں، وہاں ایک خصوصیت یہ بھی بیان
کرتے ہیں،

والشرط الخامس ان یکون تصحب المشائخ وتادب بھم دھرًا طویلًا واخذ منھم النور الباطن والسکینة وھذا الان سنة الله جرت بان الرجل لا یفلح الا اذا رای المفلحین کما ان الرجل لا یتعلم الا بصحبة العلماء وعلی ھذا القیاس غیر ذالک من الصناعات

پانچویں شرط یہ ہے کہ اس کو مشائخ کی صحبت رہی ہو اور اس نے ان سے ایک عرصۂ دراز تک ادب اور قاعدے سیکھے ہوں اور ان سے باطن کا نور اور اطمینان حاصل کیا ہو، اور یہ شرط اس لئے ہے کہ عادت اللہ یوں ہی جاری ہے کہ کسی کو مراد اس وقت تک نہیں ملتی جب تک وہ مراد پانے والوں سے نہ مل سکا ہو، اسی طرح جس طرح علم بغیر صحبت علماء کے حاصل نہیں ہوتا، نیز دوسرے ہنر بغیر استاد کے۔

مقالہ یوں ہی بہت طویل ہو گیا ورنہ موقع تھا کہ محقق دہلوی کے قول کی تصویب وتائید میں خود قرآن مجید سے استناد کیا جاتا، اور آداب مرشد پر مکالمۂ حضرت موسیٰ وخضرؑ سے کچھ روشنی حاصل کی جاتی، نیز خلیفۃ اللہ کے آگے ازراہ کبر وانانیت سر نہ جھکانے کی وعید پر قصۂ آدم وابلیس سے کچھ لطائف واشارات درج کیے جاتے،

رہے اذکار واشغال اصطلاحی اور رسوم صوفیہ مثلاً خرقہ پوشی، سو اول تو ان کا کوئی لازمی تعلق مقصود بیعت اور تلاش مرشد سے ہے نہیں، اور پھر ان میں سے اکثر چیزوں کی اصل، کسی نہ کسی حد تک سنت وآثار میں بھی مل جاتی ہے، جیسا کہ شیخ قشاشیؒ کے پر معلومات رسالہ السمط المجید (مطبوعہ دائرۃ المعارف

حیدر آباد دکن) سے ظاہر ہوگا، اور ہمارے زمانہ کے شیخ اعظم، حکیم الامت تھانویؒ نے تو یہاں تک صاف کر دیا ہے، کہ خود رسم بیعت یعنی (مرشد کا ہاتھ پکڑنا) ایک بالکل ثانوی حیثیت، بلکہ اس سے بھی کم تر درجہ کی چیز ہے، راہ سلوک میں جو کچھ اہمیت ہے، وہ مرید کی طرف سے صرف اس کے اخلاص ارادت اور عزم اتباع شیخ کی ہے،

ایک ضمنی سوال یہ تھا کہ حدیث نبوی من مات ولیس فی عنقہ بیعۃ مات میتۃ الجاھلیۃ سے کیا مراد ہے؟ سو اس کے جواب میں عرض ہے، کہ اس کا تعلق اطاعت امیر و خلیفہ سے ہے، صوفیہ کی مصطلح بیعت سے اس کا کوئی تعلق نہیں، امام مسلم اسے اپنی صحیح میں کتاب الامارۃ میں لائے ہیں، اور مشکوٰۃ میں کتاب الامارۃ ہی میں نقل ہوئی ہے، پوری حدیث کے الفاظ یہ ہیں،

عن عبد اللہ بن عمر قال	عبد اللہ بن عمرؓ روایت کرتے
سمعت رسول اللہ صلعم	ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ
یقول من خلع یدا من طاعۃ	علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ
لقی اللہ یوم القیامۃ ولا حجۃ	جو کوئی اطاعت (امیر) ترک
لہ ومن مات ولیس فی	کر دے گا، وہ اللہ کا سامنا
عنقہ بیعۃ مات میتۃ	قیامت میں یوں کرے گا کہ کوئی
الجاھلیۃ ؛	عذر اس کے پاس نہ ہوگا، اور
	جو اس حالت میں مر جائے گا کہ
	اس کی گردن میں طوق بیعت نہ
	ہوا، تو وہ گویا جاہلیت کی موت مرا،

اس سے ملتی ہوئی اور بھی متعدد حدیثیں صحیحین میں کتاب الامارۃ اور کتاب الاحکام کے ماتحت وارد ہوئی ہیں، ان سب کا مقصد اطاعت امیر اور لزوم جماعت کی

تاکید ہے، چنانچہ خود مسلم ہی کی ایک دوسری حدیث کے الفاظ ہیں،

من خرج من الطاعۃ وفارق الجماعۃ فمات مات میتۃ الجاھلیۃ	جو شخص اطاعت (امیر) سے نکل گیا اور جس نے جماعت (امت اسلامیہ) کو ترک کر دیا، اور مر گیا تو وہ جاہلیت کی موت مرا،

باقی جہاں بدقسمتی سے اسلامی حکومت ہی سرے سے نہ ہو، اور کوئی خلیفہ یا امیر یا امام مسلمین موجود ہی نہ ہو، وہاں بجز اس کے اور کیا ہوسکتا ہے، کہ امت نصب امیر کی کوشش میں برابر لگی رہے، اور اس درمیان میں اس کے قریبی مرتبوں کی تلاش جاری رہے،

عوام کے ذہن میں مرشد کی تعظیم و احترام کا جو مبالغہ آمیز اور شرک سے ڈانڈے ملا دینے والا تخیل قائم ہوگیا ہے، اُس میں اعتدال پیدا کرنا اور اس کی اصلاح ہی ضروری ہے، شیخ اول تو درجۂ کامل کے ہیں ہی کیا ___ اور پھر بالفرض وہ کامل سے کامل ہوں، جب بھی بہر حال معصوم تو نہیں ہوسکتے، مرتبہ عصمت و معصومیت صرف انبیائے کرامؑ کے لئے مخصوص ہے، شیخ غلطیاں بھی کرے گا اور اجتہادی غلطیاں تو ممکن ہے کہ کثرت سے کرجائے، دائرۂ طریقت شریعت کے اندر بھی وہ ہر خطا و لغزش سے محفوظ نہیں، اور اس کے باہر دنیا کے عام مسائل میں تو اس کی رائے وہی درجہ رکھتی ہے جو دوسرے انسانوں کی لغزشوں بلکہ معصیتوں کا صدور بھی اس سے ناممکن نہیں، بہرحال وہ ایک بشر ہی ہے، غیر معصوم۔ البتہ اس کے فضائل و کمالات کا پلہ نسبتًہ بہت بھاری ہوگا۔ گناہوں کا صدور اس سے کمتر ہی ہوگا، کبائر اصرار و تواتر کے ساتھ اُس سے صادر نہ ہوں گے، اور بحیثیت مجموعی اُس کی بصیرت دینی اور روحانی معاملات

میں تقرب الی اللہ کے وسائل و مسائل میں بہت صاف ہو گی۔

خلاصہ چند لفظوں میں یوں سمجھئے کہ

(۱) حقیقی نائبان رسول اور مصلحین کے زندہ نمونے ہر دور میں موجود رہتے ہیں، اجزائے دین میں عملی رسوخ عام سنت الٰہی کے مطابق انھیں کی صحبت و معیت سے پیدا ہوتا ہے،

(۲) اپنے امکان بھر کوشش و تلاش کر کے اپنے کو اُن تک پہونچانا اور ان سے عملی تعلیم حاصل کرنا چاہیئے۔

(۳) تاہم یہ کوئی درجہ فرض یا واجب کی چیز نہیں، اگر کسی کی رسائی ایسے مصلح تک نہ ہو سکے یا اس پر اپنی طبیعت نہ جمے تو وہ معذور ہے،

(۴) احکام دین درجۂ ضروری میں اُسے جس طرح بھی پہونچ جائیں، بس نجات و مغفرت کے لئے انھی پر عمل کافی ہے،

(۵) مرشد کا وجود ایک نعمت ہے، البتہ اسے وہ درجۂ اہمیت بھی حاصل نہیں جو اہل غلو نے اسے دے رکھا ہے، [۱]

---

[۱] اکبر الٰہ آبادی کا ایک شعر جو محض دل لگی کا نہیں ہے

تجربہ خود ہی بتا دیتا ہے مرشد اکبر بچ کہا آپ نے پیر کہاں مریدی کیسی

تلمیحات

مرتبہ محمود نیازی

تلمیحات پر اُردو میں اپنی نوعیت کی واحد کتاب جس میں ۳۲۰ تلمیحات کی مکمل شرح مع واقعات کے دی گئی ہے۔ تلمیحات سے ناواقف کبھی تحریر و تقریر پر عبور نہیں حاصل کر سکتا۔ تلمیح کے ایک دو لفظ ہی ایک پوری داستان بیان کر دیتے ہیں، لیکن ان کی تفصیلات معلوم نہ ہوں تو ان کا استعمال بھی نہیں ہو سکتا۔

مولف نے محنت شاقہ کے بعد یہ نادر مجموعہ مرتب کر کے بلا مبالغہ اردو ادب میں ایک نادر اضافہ کیا ہے۔

قیمت مجلد۔ چھ روپے